الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

امن پسندی یہ ہے کہ آدمی ——
بے امنی کے حالات میں پر امن بن کر رہ سکے

جولائی ۱۹۸۹

شمارہ ۱۵۲

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۲ جولائی ۱۹۸۹

فہرست

کرنے کا کام	صفحہ ۲	اسوۂ نبوت	صفحہ ۱۰
مٹھاس کا اضافہ	۳	پہلا کام	۱۴
ہزار میل کا سفر	۴	پیغمبر کا طریقہ	۱۷
فطری ڈھال	۵	دو اقتباس	۲۴
قضا و قدر	۷	سفر امریکہ — ۲	۲۶
۴۹ سال بعد	۸	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۵
اعترافِ حقیقت	۹	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

کرنے کا کام

ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے آغاز میں مفصل مقدمہ لکھا تھا جس میں اس نے فلسفہ تاریخ سے بحث کی تھی۔ یہ حصہ "مقدمہ ابن خلدون" کے نام سے الگ سے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اس مقدمہ کا ایک باب اس نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے کہ ۲۳ ویں فصل اس بارہ میں کہ مغلوب ہمیشہ اس بات کا شیدائی ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعار، اپنے لباس، اپنے مذہب، اپنے تمام حالات اور اپنی تمام عادات میں غالب کی پیروی کرے :

الفصل الثالث والعشرون فی ان المغلوب مولع ابداً بالاقتداء بالغالب فی شعارہ وزیہ ونحلتہ وسائر احوالہ وعوائدہ

جب ایک قوم غالب اور دوسری قوم مغلوب ہو جائے تو مغلوب قوم کے افراد میں تاثر پذیری کا عمل اپنے آپ شروع ہو جائے گا، بغیر اس کے کہ غالب قوم نے اس کے لیے کوئی براہ راست کوشش کی ہو۔

ایسی حالت میں مغلوب قوم کے رہنما اگر اپنے افراد میں تاثر پذیری کا عمل دیکھیں اور غالب قوم کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف چیخ پکار شروع کر دیں تو یہ ایک بے معنی بات ہوگی۔ کیونکہ ابن خلدون کے مطابق، یہ عمل خود تاریخی قانون کے تحت ہو رہا ہے نہ کہ حقیقۃً غالب قوم کی سازش اور جارحیت کے تحت۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے موقع پر کرنے کا اصل کام غالب قوم کے خلاف احتجاج کرنا نہیں ہے بلکہ خود مغلوب قوم کو دوبارہ اوپر اٹھانا ہے۔ غالب قوم کا اپنی برتری کے ساتھ زندہ رہنا، یہی مغلوب قوم کا موت سے دوچار ہونا ہے۔ ایک کے ابھرنے ہی کا نام دوسرے کا مٹنا ہے۔ اس لیے ایسے موقع پر غیر قوم کے خطرہ اور سازش کا انکشاف کرنا صرف اپنی بے خبری کا انکشاف کرنا ہے۔ خبردار رہنما وہ ہے جو ہر چیز کو بھلا کر مغلوب قوم کی داخلی تعمیر میں لگ جائے، جو خود اپنی قوم کو دوبارہ اٹھانے میں اپنی ساری توانائی صرف کر دے۔

مغلوب اپنی اصلاح سے دوبارہ اوپر اٹھ سکتا ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف فریاد اور مطالبہ سے۔

مٹھاس کا اضافہ

ٹائمس آف انڈیا کے ضمیمہ (The Neighbourhood Star) بابت ۱۸-۲۴ مارچ ۱۹۸۹ (صفحہ ۶) پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ ایران کے پارسی جب پہلی بار ہندستان میں آئے تو وہ ہندستان کے مغربی ساحل پر اترے۔ اس وقت یادو رانا گجرات کا راجہ تھا۔ پارسی جماعت کا پیشوا راجہ سے ملا۔ اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی ریاست میں ٹھہرنے کی اجازت دے۔ راجہ نے اس کے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس پارسی پیشوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری ریاست پہلے ہی سے آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں مزید لوگوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں۔

پارسی پیشوا نے لفظوں میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ ایک چمچہ شکر لے کر دودھ میں ملایا اور گلاس کو راجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اشاراتی زبان میں اس بات کا اظہار تھا کہ ہم لوگ آپ کے دودھ پر قبضہ کرنے کے بجائے اس کو میٹھا بنائیں گے، ہم آپ کی ریاست کی زندگی میں شیرینی کا اضافہ کریں گے۔ اس کے بعد راجہ نے انھیں گجرات میں قیام کی اجازت دیدی۔

اس واقعہ پر اب ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پارسیوں کے رہنما نے جو بات کہی تھی اس کو پارسی قوم نے پورا کر دکھایا۔ پارسی اس ملک میں مطالبہ اور احتجاج اور ایجی ٹیشن کا جھنڈا لے کر کھڑے نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی خاموش محنت سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ کیا۔ پارسیوں نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ وہ تعلیم اور تجارت اور صنعت میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ملک کی دولت اور ملک کی ترقی کو بڑھایا۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ لینے والے گروہ (Taker group) کی حیثیت رکھتے ہیں، پارسیوں نے عمل کے ذریعہ اپنے لیے دینے والے گروہ (Giver group) کا درجہ حاصل کیا ہے ——— یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اس آدمی کو باعزت جگہ ملتی ہے جو لوگوں کے "دودھ" میں اپنی طرف سے "مٹھاس" کا اضافہ کرے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف کڑواپن ہو، انھیں بھی اس دنیا میں وہی چیز ملتی ہے جو انھوں نے دوسروں کو دی ہے۔

ہزار میل کا سفر

چینی زبان میں ایک مثل ہے کہ "ہزار میل کا سفر ایک قدم سے شروع ہوتا ہے"۔ یعنی کسی شخص کو ہزار میل دور جانا ہو تب بھی پہلے قدم ہی سے اس کے سفر کا آغاز ہوگا۔ ایک ایک قدم چل کر ہی وہ اپنی منزل پر پہونچے گا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ پاؤں اٹھاتے ہی وہ پہلا قدم اپنی آخری منزل پر رکھ دے۔

یہ زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔ ایک فرد کا سفر بھی اسی اصول پر عمل کرکے کامیاب ہوتا ہے اور ایک قوم کا سفر بھی۔

اگر آپ ایک لاکھ روپیہ کمانا چاہتے ہیں تب بھی ابتداءً آپ کو ایک ایک روپیہ کی کمائی پر قناعت کرتے ہوئے ایک لاکھ کی کمائی تک پہونچنا ہوگا۔ اگر آپ ماسٹر ڈگری لینا چاہتے ہیں تو ابتدائی درجات میں محنت کرکے ماسٹر ڈگری کے قابل بننا ہوگا۔ اگر آپ مصنف بننا چاہتے ہیں تو مطالعہ اور تحقیق کے لمبے مرحلہ سے گزرنے کے بعد مصنف کے مقام کو پانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان دیکھنا چاہتے ہیں تو بنیاد اور دیوار کی تعمیر کرنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے لیے ایک اونچا مکان کھڑا کرسکیں۔

ٹھیک یہی معاملہ قومی تعمیر کا بھی ہے۔ قومی تعمیر "تاریخ ساز" تقریروں سے نہیں ہوتی، بلکہ تاریخ ساز عمل سے ہوتی ہے۔ ملت کا مستحکم قلعہ مستحکم پتھروں سے بنتا ہے نہ کہ لفظی خطابت اور شاعرانہ خیال آرائی کا کمال دکھانے سے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ہر ایک نے کسی نہ کسی "مجاہدانہ اقدام" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ شعور کی اصلاح اور ذہن کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ پُرشور ہنگاموں کے باوجود اب تک کوئی نتیجہ خیز کام نہ ہوسکا۔ تعمیر ملت کا کام فکری تعمیر اور ذہنی اصلاح سے شروع ہوتا ہے، اس کو عملی اقدام (بالفاظ دیگر، چھلانگ) سے شروع نہیں کیا جاسکتا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ان کے رہنماؤں کی یہی مجرمانہ غفلت ہے۔

فطری ڈھال

۱۹۷۳ میں ہندستان کے جنگلوں میں تقریباً ۱۸۰۰ شیر تھے۔ اس کے بعد شیر کی نسل بڑھانے کے لیے شیر منصوبہ (Project Tiger) شروع کیا گیا۔ یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ چنانچہ اب شیروں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ تاہم شیر کی تعداد بڑھنے سے خطرہ بھی بڑھ گیا ہے۔ یوپی کی ترائی میں دُدھوا نیشنل پارک ہے۔ اسی طرح ہندستان اور بنگلہ دیش کے درمیان سندربن ہے۔ یہاں شیر اکثر باہر آکر گاؤں والوں کے مویشی مار ڈالتے ہیں۔

تاہم ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ شیر انسان کے اوپر حملہ کرے۔ شیر اگر انسان کے اوپر حملہ بھی کرتا ہے تو پیچھے کی طرف سے کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیر انسان کے چہرے سے ڈرتا ہے۔ ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، ۱۱ دسمبر ۱۹۸۸) میں بتایا گیا ہے کہ سندربن کے جنگل میں جو لوگ ضرورت کے تحت شیر کے مخصوص علاقہ میں داخل ہوتے ہیں، وہ اپنے سر کے پیچھے کی طرف مکھوٹا ڈال لیتے ہیں۔ تاکہ سامنے کی طرح ان کے پیچھے بھی انسانی چہرہ دکھائی دے۔ اس تدبیر کی وجہ یہ ہے کہ شیر بہت کم ایسا کرتا ہے کہ وہ سامنے سے انسان کے اوپر حملہ کرے:

Those that do enter the buffer zone of the Sundarbans wear masks on the back of their heads because a tiger seldom attacks a man from the front.

انسان کے چہرے میں فطری طور پر رعب کی صفت ہے۔ یہ رعب جس طرح جانوروں کے مقابلہ میں ایک روک ہے، اسی طرح وہ انسانوں کے مقابلہ کے لیے بھی روک ہے۔ شیر انسانی چہرہ سے مرعوب ہو کر اس پر حملہ کی جرأت نہیں کرتا۔ شیر انسان کے اوپر صرف اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ انسان نے اپنی ناکافی کارروائی سے شیر پر یہ ظاہر کر دیا ہو کہ وہ اس کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ یہی معاملہ انسان کے مقابلہ میں انسان کا بھی ہے۔ فطری حالت میں ایک انسان دوسرے انسان کے چہرے سے ہیبت زدہ رہتا ہے۔ یہ ہیبت صرف اس وقت ختم ہوتی ہے جب کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جو فطری حالت کو توڑنے کا سبب بن جائے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا (خلق اللہ آدم علیٰ صورتہ)

یہ روایت اگرچہ باعتبار سند کمزور ہے، مگر باعتبار معنی وہ درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا چہرہ ساری معلوم کائنات میں سب سے زیادہ پر شوکت چیز ہے۔ وہ اپنے اندر ایک برتر عظمت لیے ہوئے ہے۔

خدا نے آپ کے چہرہ اور آپ کی شخصیت کو آپ کے لیے ایک غیر مفتوح ڈھال بنایا ہے۔ آپ ہر ضرورت کے موقع پر اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے دوسروں کی نظر میں اپنی کیا تصویر بنائی ہے۔

اگر آپ نے اپنے ماحول میں اپنی یہ تصویر بنائی ہو کہ آپ ایک سطحی اور بے قیمت انسان ہیں، آپ صرف جھوٹی لڑائی لڑنا جانتے ہیں۔ آپ اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں اور دھمکی سن کر اقدام ملتوی کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب آپ دوسروں کے سامنے آئیں گے تو آپ کا آنا ایک بے وزن انسان کا آنا ہوگا۔ اس وقت آپ گویا ایک ٹوٹی ہوئی ڈھال ہوں گے جس کے اندر لوگوں کے لیے کوئی زور نہیں۔

اس کے برعکس اگر آپ نے اپنے آس پاس اپنی یہ تصویر بنائی ہے کہ آپ ایک بھاری بھرکم انسان ہیں۔ آپ کے اعلیٰ اخلاق نے لوگوں کو آپ کا معترف بنا رکھا ہو۔ ایسی حالت میں آپ کے سامنے آتے ہی لوگوں کی نظریں آپ کے لیے جھک جائیں گی۔ آپ کا آنا "وہ آیا، اس نے دیکھا، اس نے فتح کر لیا" کا ہم معنی بن جائے گا:

He came, he saw, he conquered.

آپ کا انسانی چہرہ آپ کے حق میں ایک مرعوب کن ڈھال ہے۔ کوئی انسان آپ کے اوپر صرف اس وقت وار کرنے کی ہمت کرتا ہے جب کہ آپ اپنی کسی نادانی سے اس پر یہ ظاہر کر دیں کہ آپ اس سے کمزور ہیں۔ دانش مندی کے ذریعہ اپنے رعبِ انسانی کو قائم رکھیے، اور پھر کوئی شخص آپ کے اوپر وار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

قضا و قدر

مارک ٹوین (Mark Twain) ایک انگریزی ادیب اور ناول نگار تھا۔ وہ ۱۸۳۵ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ اور وہیں ۱۹۱۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ اب میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اور اپنی زندگی میں بہت سی چیزوں کے لیے فکرمند ہوا ہوں۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کبھی وقوع میں نہیں آئیں :

I am an old man and have known a great many troubles, but most of them never happened.

راقم الحروف کا تجربہ بھی یہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اور دوسروں کی زندگی میں بہت سے ایسے مواقع دیکھے ہیں جب کہ ایک آدمی کسی صورت حال کے پیش آنے کی وجہ سے سخت پریشان ہوگیا۔ حتی کہ مستقبل کے اندیشہ کی بنا پر اس نے اپنے حال کو برباد کرلیا۔ غم سے نڈھال ہوکر اپنی صحت تباہ کرلی۔ مگر وقت گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اندیشہ بجائے خود صحیح نہ تھا جس کی وجہ سے آدمی نے اپنے آپ کو اتنا زیادہ پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔

اسلام میں اس کا بہترین حل قضا و قدر کا عقیدہ ہے۔ مفصل کلمہ میں یہ بات بطور ایمان شامل کی گئی ہے کہ خیر اور شر دونوں اللہ کی طرف سے آتے ہیں (وبالقدر خیرہ وشرّہ)

"کوشش کرنا بندہ کا کام ہے، اور تکمیل تک پہنچانا اللہ کا کام" اور یہ کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہوتا ہے" یہ عقیدہ انسان کے لیے موجودہ دنیا میں ایک بے حد عظیم تحفہ ہے۔ وہ انسان کے اندر یہ طاقت پیدا کرتا ہے کہ وہ نقصان کو سہے اور حادثات کو برداشت کرسکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنی ہے۔ اس لیے یہاں عین اس کے تخلیقی نقشہ کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی زندگی میں ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ اس کو نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ عقیدہ آدمی کے اندر بیٹھ جائے کہ جو ہوا وہی ہونے والا تھا، اس کے سوا کچھ اور ہونا ممکن نہ تھا تو آدمی کی زندگی نہایت سکون کی زندگی بن جائے، وہ راضی برضا ہوکر ہر حال میں پوری طرح مطمئن رہے۔

۴۹ سال بعد

۲ اپریل ۱۹۸۹ کو دہلی یونیورسٹی میں کانوکیشن کی ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ اس موقع پر مسٹر ایم فاروقی کو ایم اے (تاریخ) کی، اور مسٹر ڈی سانگھی کو بی اے کی ڈگری دی گئی۔ ان دونوں نے ۴۹ سال پہلے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے اور بی اے کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا تھا۔ مگر اس وقت کی انگریز حکومت نے ان کی ڈگریاں ضبط کرلیں۔ اب نئی حکومت نے ضبطی کے حکم کو منسوخ کرتے ہوئے دونوں کو ان کی ڈگریاں دیدی ہیں جن کے وہ جائز طور پر مستحق تھے۔

یہ ۱۹۴۰ کا واقعہ ہے۔ اس وقت دہلی پراونشیل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں مسٹر فاروقی صدر اور مسٹر سانگھی سکریٹری تھے۔ مدراس اور یوپی کی حکومت کی طرف سے یہ سرکلر جاری کیا گیا کہ طلبہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں، ورنہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ مسٹر فاروقی اور مسٹر سانگھی نے اس سرکاری حکم کے خلاف تقریریں کیں۔ اور ۱۶ نومبر ۱۹۴۰ کو دہلی کے اسکولوں اور کالجوں میں اسٹرائک کرائی۔ اس جرم کے نتیجہ میں دونوں صاحبان دہلی یونیورسٹی سے ایک سال کے لیے خارج کردیئے گیے۔ اسی سال (نومبر ۱۹۴۰) میں دونوں کی ڈگریاں ضبط کرلی گئیں۔ ضبطی کا حکم اس وقت دہلی یونیورسٹی کے انگریز وائس چانسلر سر مارس گوائر (Sir Maurice Gwyer) نے جاری کیا تھا۔ اب ۴۹ سال بعد دونوں کو ان کی ڈگریاں اعزاز و اکرام کے ساتھ دیدی گئی ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۳ اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۵)

دنیا کا یہ واقعہ آخرت میں پیش آنے والے واقعہ کی ایک تصویر ہے۔ آج کی دنیا میں متکبر اور خود پسند لوگوں کا غلبہ ہے۔ وہ خدا کے سچے بندوں سے ان کی "ڈگریاں" چھینے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے برسرِ حق ہونے کا اعتراف نہیں کرتے۔ وہ ان کی اعلیٰ خدمات کو بے وزن بتاتے ہیں۔ وہ ان کو بالقصد عزت کے مقامات سے دور رکھتے ہیں۔ مگر جب قیامت آئے گی اور انسانی اقتدار کی جگہ خدائی اقتدار قائم ہوگا تو ساری صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ اس وقت ان محروموں کو مزید اضافہ کے ساتھ ان کی "ڈگریاں" انھیں عطا کی جائیں گی۔ آج کے دن اور آنے والے دن کے درمیان "۴۹ سال" سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔

اعترافِ حقیقت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام امیہ ابن ابی الصلت تھا۔ وہ طائف کے قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ نہایت ہوشیار اور صاحب شخصیت آدمی تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عالم بھی تھا۔ اس کو یہود کی کتابوں کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ عرب میں خدا کا آخری پیغمبر آنے والا ہے۔ اس کو اپنی بڑائی کا اتنا زیادہ احساس تھا کہ اس نے بطور خود یہ سمجھ لیا کہ خدا اس کو اپنا پیغمبر مقرر کرے گا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ مقام محمد بن عبداللہ کو دیدیا گیا ہے تو اس پر سخت ردعمل ہوا۔ وہ آپ کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔

اس عرب کردار کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے ـــــ اور لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ اس سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے، مگر وہ زمین کا ہو رہا اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا (الاعراف ۷۶-۱۷۵)

امیہ ابن ابی الصلت کے لیے اللہ نے یہ مقدر کیا تھا کہ وہ وقت کے پیغمبر کا پیرو بن کر رفعت حاصل کرے۔ مگر اس نے خود پیغمبر بننا چاہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پست اور ذلیل ہو کر رہ گیا۔ اس کے برعکس مثال مکہ کے عمر بن الخطاب کی ہے۔ ان کو بھی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتیں ملی تھیں۔ مگر انھوں نے اس خبط کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دی کہ وہ خود پیغمبر بنیں۔ اس کے بجائے وہ پیغمبر کے پیرو بننے پر راضی ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کی تاریخ میں، پیغمبر اور ابوبکر صدیق کے بعد تیسری سب سے بڑی شخصیت قرار پائے۔ اس کے علاوہ عالمی تاریخ میں ان کو اتنا ممتاز مقام ملا کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب (The 100) میں دنیا کے بڑوں کی فہرست میں ان کو نمبر ۵۱ پر جگہ دی ہے۔ جب کہ امیہ بن ابی الصلت کو کہیں کوئی جگہ نہ مل سکی۔

انسان اکثر حالات میں اپنا مبالغہ آمیز اندازہ کرتا ہے۔ وہ پیرو کا کردار ادا کرنے کے بجائے قائد کا کردار ادا کرنے کا خواہش مند بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ خدا کے منصوبہ کے خلاف ہے، اور خدا کے منصوبہ کے خلاف چلنا کسی آدمی کو بربادی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچاتا۔

اسوۂ نبوت

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک انتہائی لغو کتاب ہے۔ اس کتاب کی لغویت کے بارہ میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے۔ مگر اس کتاب کے بارہ میں مسلمانوں کا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رائے ان لوگوں سے مختلف ہے جو یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ رشدی کو قتل کر کے اسے جہنم رسید کرو۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ کہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تمام باتیں نہ صرف پچھلے ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں کہی جاتی رہی ہیں، بلکہ یہ خود اس زمانہ میں بھی کہی گئی تھیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔ اس وقت آپ نے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس کو معلوم کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسی قسم کے موجودہ واقعہ میں ہم کیا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اس معاملہ میں کسی اجتہاد یا قیاس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبرِ اسلام کا اسوہ (نمونہ) واضح طور پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

چند مثالیں

۱۔ سلمان رشدی کی کتاب میں ایک بات نعوذ باللہ یہ کہی گئی ہے کہ قرآن میں جبریلؑ کی لائی ہوئی آیتوں کے ساتھ شیطان کی القاء کی ہوئی آیتیں بھی شامل تھیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب کا نام "شیطانی آیات" رکھا ہے۔ یہ نام زیادہ صحیح طور پر خود رشدی کی کتاب پر صادق آتا ہے۔ تاہم اس نے اپنے خیال کے مطابق، یہ نام قرآن کو دینا چاہا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنا یہ نظریہ اس قصہ کی بنیاد پر کھڑا کیا ہے جس کو غرانیق کا قصہ کہا جاتا ہے۔ یہ قصہ، جس کی تفصیل دوسرے مضمون میں بتائی گئی ہے، اس وقت گھڑا گیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے اس لغو قصہ کے ابتدائی مصنف مکہ کے مشرکین تھے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ان مشرکوں کے اوپر آپ کو مکمل قابو حاصل ہو گیا۔ مگر آپ نے یہ

اعلان نہیں فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غرانیق کا جھوٹا قصہ گھڑا تھا، انہیں قتل کر کے ان سب کو جہنّم رسید کر دو۔ اس کے برعکس آپ نے ان سے فرمایا کہ اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کیا، نہ کہ اسلام کی شمشیری طاقت پر۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اگرچہ آپ نے ان پر تلوار استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام کی نظریاتی طاقت نے ان کو مسخر کر لیا۔ ان کو آزادی دینے کے جلد ہی بعد وہ اسلام کے عقیدہ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق سے اتنا متاثر ہوئے کہ کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خدا کی غلامی میں دے دیا۔

۲۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محاونڈ (Mahound) لکھا ہے۔ یہ ایک استہزائی نام ہے۔ جس طرح بعض لوگ وہابی کو وہابڑا اور دیوبندی کو دیو کے بندے وغیرہ کہتے ہیں، اس طرح سلمان رشدی نے آپ کے لیے اس بگڑے ہوئے نام کو استعمال کیا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے عیسائیوں نے آپ کے لیے گھڑا تھا۔

اس مجرمانہ حرکت کی مثال بھی زمانۂ نبوت میں موجود ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اگرچہ آپ کے دادا عبد المطلب نے محمد رکھا تھا، مگر مکہ کے قریش نے استہزائی طور پر آپ کا نام مذمّم رکھ دیا۔ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا ہوا۔ جبکہ مذمّم کے معنی ہیں مذمّت کیا ہوا۔ ابولہب کی بیوی ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے مذمّم کے لفظ کو لے کر شعر کہا تھا اور اس کو اس طرح پڑھا کرتی تھی :

مذمما عصینا، وامره ابینا، ودینه قلینا

ہم نے ایک قابلِ مذمّت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

اس معاملہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یہ فرمایا ہو کہ دیکھو فلاں لوگ میرا نام بگاڑ کر مجھ کو مذمّم کہتے ہیں، ان سب کو قتل کر دو۔ اس کے

برعکس جو ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کا نام مذمم رکھتے تھے۔ اور پھر اسی نام سے آپ کو گالی دیتے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ کیا تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی ایذا رسانی کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو گالی دیتے ہیں اور مذمم کہہ کر میری ہجو کرتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قال ابن اسحاق۔ وکانت قریش انما تسمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مذمما ثم یسبونہ۔ فکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول: الا تعجبون لما صرف اللہ عنی من اذی قریش یسبون ویھجون مذمما وانا محمد

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۷۹)

یہاں دوبارہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کو اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ مگر آپ اپنے اصحاب سے یہ نہیں کہتے کہ یہ لوگ ناقابلِ معافی جرم کے مجرم ہیں، ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ اس کے برعکس آپ اپنے اصحاب کی توجہ قولِ انسانی سے ہٹا کر قولِ خداوندی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ انسان اگر میری مذمت کرتے ہیں اور میرا سب وشتم کر رہے ہیں تو اس سے کیا ہوا۔ تمام انسانوں کے رب اور ساری کائنات کے مالک نے ابدی طور پر مجھے محمد کے مقامِ اعلیٰ پر فائز کر دیا ہے۔ پھر ان کی بے ہودہ گوئی کی پروا کرنے کی مجھے کیا ضرورت۔

۳۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں ایک اور نہایت بے ہودہ حرکت یہ کی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ کو نعوذ باللہ ایک بدکردار خاتون کے روپ میں دکھایا ہے۔ یہ بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک ایک بے ہودہ بات ہے۔ کوئی مسلمان کتاب کے اس حصہ کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔

مگر یہاں بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ امہات المومنین کی کردار کشی کا یہ جرم پہلی بار رشدی کی کتاب میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ شنیع جرم اس سے پہلے خود زمانۂ رسالت میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح صفوان بن معطل کے ایک واقعہ کو

شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ منافقین نے یہ جھوٹا افسانہ گھڑا۔ اور اس کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کی۔

یہ افسانہ اس وقت اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ کئی مخلص مسلمان تک اس سے متاثر ہو گئے۔ ایک مہینہ تک مدینہ کی پوری فضا شرمناک افواہوں سے بھری رہی۔ یہ تکلیف دہ صورتِ حال صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے مداخلت فرمائی۔ اور قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ محض جھوٹا پروپیگنڈہ ہے نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

مگر اس وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دے دیں جو کردار کشی کی اس جھوٹی مہم میں ملوث تھے۔ کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ امہات المومنین کی کردار کشی کے ان مجرمین کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مرے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے آخری حساب کے لیے پہنچا دیے گئے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ الزام کی طاقتور تردید کر کے مجرمین کو چھوڑ دیا جائے تاکہ لوگ ساری عمر ان کی لعنت کریں، اور پھر مر کر وہ اللہ کی عدالت میں پہنچا دیے جائیں تاکہ وہ اپنے خلاف ابدی لعنت کا فیصلہ سنیں اور ہمیشہ کے لیے رسوائی کے گڑھے میں پڑے رہیں۔

یہ ہے اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔ اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں، اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے، تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانونِ جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے نام پر انہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انہیں ڈرنا چاہیے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں وہ خود اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بڑا مجرم نہ بنا لیں۔

پہلا کام

سلمان رشدی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ـــــــ آدھی رات کے بچے" (Midnight's Children) اس کتاب میں سلمان رشدی نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں عقیدہ اور بے عقیدگی کے درمیان جھول رہا ہوں

I am hanging between belief and disbelief.

رشدی کا یہ کہنا کہ میں مذہب کے معاملہ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں، یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کا معاملہ ہے۔ سلمان رشدی نے جو بات اپنے بارے میں کہی ہے یہی کروروں مسلمانوں کی بات ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس کی تعلیم جدید ماحول میں ہوئی ہے اس کا کم از کم ۷۵ فیصد حصہ اسی قسم کی بے یقینی میں مبتلا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی شخص نے رشدی والا قلمی پیشہ اختیار کیا اور وقتی فائدے کی خاطر اپنے دل کی گندگی کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ کسی اور میدان میں کھانے کمانے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ انہیں رشدی جیسی گندی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں جب کہ میں امریکہ میں تھا، مجھے وہاں کے ایک اسلامی مرکز میں لے جایا گیا۔ یہ مرکز جس خطہ میں واقع ہے وہاں تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ میں نے منتظمین سے پوچھا کہ اس علاقہ کے ایک لاکھ مسلمانوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس اسلامی مرکز سے جڑے ہوئے ہوں۔ ایک ذمہ دار نے جواب دیا کہ دس فیصد مسلمان ہیں۔ حاضرین میں سے دوسرا شخص بولا کہ آپ مبالغہ کر رہے ہیں، بمشکل ۵ فیصد تعداد ہوگی جو اس مرکز سے جڑی ہوئی ہو۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں ان کی نئی نسلوں کی بیشتر تعداد اسلام سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے۔ ان کو نماز، روزے سے کوئی مطلب نہیں، جنس اور شراب اور غذا کے معاملہ میں ان کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے آزاد خیال امریکیوں کے ہیں۔ وہ بس برائے نام مسلمان ہیں۔

یہ کوئی انکشاف کی بات نہیں۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "رشدی" ہمارے درمیان ایک نہیں، بلکہ کروروں کی تعداد میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی "رشدیت" ظاہر ہو چکی ہے اور کسی کی اب تک چھپی ہوئی ہے۔

مسلم نسل کی یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کی ترقی یافتہ زبانوں میں اعلیٰ معیار کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ "ارتداد ذہنی" میں مبتلا ہونے والے ان بے شمار مسلمانوں کی بے یقینی کو دوبارہ یقین میں تبدیل کیا جا سکے۔ ان کو بے عقیدگی کے دلدل سے نکال کر دوبارہ عقیدہ کی صالح زمین پر کھڑا کیا جائے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو اس کام کو موثر اسلوب اور مطلوبہ معیار پر انجام دے رہا ہو۔ اپنے دعویٰ کے مطابق بہت سے لوگوں نے عصری کتابیں چھاپ رکھی ہیں مگر یہ نام نہاد عصری کتابیں عصری کوڑا خانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "دورِ جدید کی تحریکیں"۔ اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دورِ جدید میں اسلام کے احیار کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مگر کتابوں کے اَن گنت انبار کے باوجود، یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابلِ ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستوی پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس مضمون کی اشاعت پر اب دو سال کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ مگر آج تک کسی مسلم ذمہ دار کی طرف سے ایسی کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی گئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اوّلین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں۔ وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے طریقِ استدلال اور اسلوبِ تحریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور اس کے بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔ مگر جدید اسلوب میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار، موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کر کے شائع نہ کر سکے۔

ایسی حالت میں مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقۃً خود اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اس کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ہے جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ بن کیے پر کریڈٹ لینا چاہیں ان کے لیے خدا کے یہاں عذاب ہے نہ کہ انعام۔

دینِ کامل

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۳۶۸

ھدیہ ۴۰ روپیہ

قرآن میں اسلام کو دینِ کامل کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دینِ مستحکم ہے۔ اسلام کا ظہور، دینِ خداوندی کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔ اسلام نے خدا کے دین کے ساتھ انسانی تعدی کے دور کو ختم کر دیا اور دین کو تمام پہلوؤں سے کامل کر کے اس کو ایسا مستحکم بنا دیا کہ قیامت تک اس کی برتری باقی رہے وہ اپنے پیروؤں کے لیے ابدی سرفرازی کی ضمانت بن جائے۔

پیغمبر کا طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کا استقبال ان کی قوموں نے بہت بُرے انداز سے کیا۔ انھوں نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کی۔ ان کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے، وغیرہ۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا کہ اس قسم کے مجرمین کو گردن زدنی قرار دے کر فوراً انہیں قتل کر دیا جائے۔ بلکہ دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی کاٹ کی گئی۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے۔

ویقولون انہ لمجنون ۔ وما ھو الا ذکر للعالمین (القلم ۵۱ — ۵۲) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور دیوانہ ہے۔ حالانکہ وہ صرف نصیحت ہے سارے عالم والوں کے لیے۔

ان آیات پر غور کیجئے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ لوگ خدا کے پیغمبر کو مجنون کہتے ہیں، اس لیے انہیں فوراً قتل کر دو۔ بلکہ دلیل کی زبان میں ان کی بات کو رد کیا گیا۔ اس آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ اے پیغمبر کو مجنون کہنے والو، پیغمبر کے کلام کو دیکھو۔ کیا مجنون کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس قرآن کو وہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے، وہ سراپا نصیحت ہے۔ اس میں ساری انسانیت کے لیے بہترین پیغام ہے۔

کیا کوئی جنون والا آدمی ایسی کتاب لا سکتا ہے جس میں اتنی اعلیٰ تعلیمات درج ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ نے ہجو اور استہزار کے مواقع پر یا تو صبر کیا، یا دلیل کی زبان میں ان کا رد کیا۔

آپ قاتلِ عالم نہیں تھے بلکہ رحمتِ عالم تھے۔ اور رحمتِ عالم وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوگوں کی ایذا رسانی کے باوجود انہیں معاف کرے، جو لوگوں کی طرف سے اشتعال انگیز سلوک کے باوجود ان کے لیے رحمت کا پیکر بنا رہے۔ آپ کی یہی بلند کرداری ہے جس کی شہادت قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی ہے: انک لعلیٰ خلقٍ عظیم (بے شک تم بلند اخلاق پر ہو)

دعوتی تصویر

اسلام ایک دعوت ہے نہ کہ محض ایک تعزیری قانون۔ اسلام کی اوّلین دلچسپی خدا کے بندوں

کو خدا کا پرستار بنانا ہے نہ کہ انہیں مجرم قرار دے کر انہیں کوڑا مارنا اور گولی اور پھانسی کا نشانہ بنانا۔

تعزیری قانون کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مگر دعوت کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے۔ داعی لوگوں کو ختم کرنے کے بجائے لوگوں کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے داعی ایسا نہیں کرتا کہ لوگوں کے خلاف اندھا دھند سزائیں جاری کرنا شروع کر دے۔ وہ یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کے "حال" سے زیادہ انسان کے "مستقبل" پر نظر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر اس کے بارہ میں نرم گوشہ پیدا ہو، وہ لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے تاکہ جو لوگ آج اس کے ہجو گو ہیں، کل وہ اس کے مدح خواں بن جائیں۔ جو لوگ ابھی اس کے ساتھی نہیں بنے، آئندہ وہ اس کے شریک اور ساتھی بن جائیں۔ داعی کا کام غیر کو اپنا بنانا ہے، نہ کہ جو غیر دکھائی دے اس کا دشمن بن کر صرف اس کی ہلاکت کے درپے ہو جانا۔

بدنامی سے بچت

کسی کارخانہ کی خوش نامی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کی اشاعت کے لیے اس کی دعوتی تصویر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ بات آخری حد تک مطلوب ہے کہ اسلام کی دعوتی تصویر کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہے، حتیٰ کہ توہینِ رسول اور اہانت اسلام جیسے جذباتی مواقع پر بھی۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں عبد اللہ بن ابی بن سلول کی مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ شخص مدینہ کے قبیلۂ خزرج کا سردار تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر مدینہ کے لوگوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا۔ اس کے لیے ایک تاج کی تیاری بھی شروع ہو گئی ـــــ عین اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ یہاں آتے ہی لوگوں نے آپ کو اپنا بڑا بنا لیا۔ عبد اللہ بن ابی کو اس سے بہت تکلیف پہنچی۔ حالات کے دباؤ کے تحت اس نے رسول اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ تاہم اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے ساری عمر آپ کی توہین و تحقیر کرتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لیے نکلے۔ آپ

ایک گدھے پر سوار تھے۔ راستہ میں عبداللہ بن ابی کا قلعہ نما مکان آیا جس کا نام مزاحم تھا۔ اس وقت عبداللہ بن ابی کے گرد اس کے قبیلہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ وہاں سواری سے اتر پڑے اور عبداللہ بن ابی کے پاس پہنچ کر اس کو سلام کیا۔ آپ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔

راوی (اسامہ بن زید بن حارثہ) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بے پروائی کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب آپ فارغ ہو چکے تو عبداللہ بن ابی نے کہا: اے شخص، آپ کی یہ بات تو اچھی ہے، لیکن اگر وہ حق ہے تو آپ اپنے گھر میں بیٹھیں اور جو شخص اس کو سننے کے لیے آپ کے پاس آئے اس کو سنائیں، اور جو شخص آپ کے پاس نہ آئے تو اس کو آپ اس کی تکلیف نہ دیں۔ اور ایسے شخص کی مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں جو اس کو ناپسند کرتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ بن ابی کا یہ قول سخت ناگوار ہوا مگر آپ خاموشی سے آگے بڑھ گئے (سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۱۹)

غزوۂ احد (شوال ۳ھ) میں قریش کا لشکر مکہ سے چل کر مدینہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ فرمایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ شہر کے اندر ٹھہر کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے یہی دوسری رائے پیش کی۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے گروہ کی رائے کا لحاظ فرمایا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

جب آپ مدینہ اور احد کے درمیان پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر اسلامی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس طرح اس نے بے حد نازک موقع پر سخت بے وفائی کا ثبوت دیا۔ مزید یہ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی بھی کی۔ اس نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا کہ اس شخص نے دوسروں کی بات مانی اور میری بات نہیں مانی۔ لوگو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم یہاں کس لیے اپنے آپ کو ہلاک کریں (اطاعہم وعصانی، ماندری علام نقتل انفسنا ھٰھنا ایہا الناس) (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۸)

غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۶ھ میں ہوا۔ اس مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبداللہ بن ابی بھی تھا۔ سفر سے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قافلہ نے ایک

مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ صبح کو اندھیرے میں روانگی ہوئی۔ اس وقت ایک اتفاقی غلطی سے حضرت عائشہ، جو آپ کے ساتھ شریکِ سفر تھیں، قافلہ سے پیچھے رہ گئیں۔ سورج نکلنے کے بعد ایک صحابی صفوان بن معطّل سُلَمی اس جگہ سے گزرے۔ انہوں نے حضرت عائشہ کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود اس کی نکیل پکڑ کر آگے چلتے ہوئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ اس واقعہ کو عبداللہ بن ابی نے خوب استعمال کیا۔ حضرت عائشہ کا اس طرح تنہا ایک نوجوان کے ساتھ آنا ایک ہنگامی سبب سے تھا۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اس کو برے معنی پہنا کر خوب تقریریں کیں۔ اس نے اس واقعہ کو پیغمبر کی کردار کشی کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ پورے مدینہ میں آپ کے خلاف شک وشبہ کی فضا پیدا ہوگئی۔

اس واقعہ کی تفصیلات سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص نے اس بہتان تراشی میں سب سے بڑا حصہ ادا کیا اس کے لیے عذابِ عظیم ہے (النور ۱۱) اس آیت میں جس شخص کے لیے سب سے بڑے عذاب کا ذکر ہے، اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے۔ مگر اس کو دنیا میں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس کے معاملہ کو تمامتر آخرت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

غزوۂ بنی المصطلق (۵ ھ) سے واپسی میں ایسا ہوا کہ پانی کے ایک چشمہ پر پانی لینے کے لیے مسلمانوں کا ہجوم ہوگیا۔ اس وقت ایک مہاجر اور ایک انصاری آپس میں لڑ گئے۔ مہاجر نے کہا: یا للمہاجرین، انصاری نے کہا: یا للانصار۔ یہاں تک کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداخلت فرما کر اس کو ختم کیا۔

عبداللہ بن ابی پہلے سے اس بات پر خوش نہ تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ بلا کر انہیں یہاں پناہ دی جائے۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس میں اس نے کہا کہ اپنے کتے کو پال کر موٹا کرو کہ وہ تمہیں کو کاٹ کھائے۔ خدا کی قسم، اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔

عبداللہ بن ابی کی یہ باتیں سن کر صحابہ کو غصہ آگیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسولؐ،

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (دعہ لا یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ) تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۳۷۰)

مزید مثالیں

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لیث بن سعد نے یحییٰ بن سعید سے، انھوں نے ابوالزبیر سے روایت کی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا کہ جعرانہ میں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔ آدمی نے دیکھ کر کہا کہ اے محمد، انصاف کیجئے (یا محمد اعدل) آپ نے فرمایا، تمہارا برا ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ گفتگو سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں، آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ (معاذ اللہ ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۶۸۷

غزوۂ تبوک کی واپسی میں کچھ منافق قسم کے مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ مخلص مسلمانوں سے الگ ہو کر بیٹھتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے ہودہ باتیں کیا کرتے۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم انھیں قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (اکرہ ان یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الرابع، صفحہ ۳۵۔

زیادہ قابلِ لحاظ

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور آپ کے خلاف سب وشتم والے افعال

کیے۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام کو وہ قابلِ قتل نظر آنے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اجازت دیں تو وہ انہیں قتل کر دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل کی اجازت نہ دی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر میں ان کو قتل کر دوں تو لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو "قتل شاتم" سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اور وہ اسلام کی دین رحمت کی تصویر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں دعوتی تصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دعوتی تصویر بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک شخص کے کھلے ہوئے سب وشتم اور اس کی شدید ایذا رسانی کے باوجود اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی زیادہ سنگین نظر آتی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں کا مجروح ہونا خدا اور رسول کی نظر میں اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ دعوتی مصلحت کا مجروح ہونا۔ اگر کسی معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں تو انہیں اپنے جذبات کو دبانا چاہیے، نہ کہ وہ جذبات کا بے جا اظہار کریں اور دعوت کے قیمتی مصالح کو برباد کر کے رکھ دیں۔

اغیار کو موقع نہ دینا

مذکورہ واقعات میں جن افراد کا ذکر ہے، ان کی توہین رسول اور اسلام دشمنی بالکل واضح تھی۔ اپنے کردار کے اعتبار سے بلاشبہ وہ لوگ اس کے مستحق بن چکے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر صحابہ کرام نے ان کو اعداء اللہ قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اجازت دیجیے کہ ہم خدا اور رسول کے ان دشمنوں کو قتل کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان اشخاص کو قتل کرتے تو اس کی وجہ یقیناً ان کی اسلام دشمنی ہوتی۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں جہاں ہر ایک کو آزادی ہے، آپ کسی کو اس پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ وہی الفاظ بولے جو آپ چاہتے ہیں کہ بولا جائے۔ چنانچہ یہ یقینی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر صرف ان کے شتم کو دیکھا اور شتم کی سزا کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کو نہیں دیکھا اور ان

افراد کو قتل کرایا تو اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ اصل واقعہ کے مطابق صرف یہ کہیں کہ "محمد نے اسلام دشمنوں کو قتل کیا ہے"۔ اس کے برعکس یقینی تھا کہ وہ یہ کہیں گے کہ "محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں"۔ ان برے لوگوں کا قتل بجائے خود ایک صحیح فعل تھا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یقینی تھا کہ صحیح ہونے کے باوجود وہ عوام کے درمیان اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ نہ تھا کہ پہلے قتل کر دیں۔ اور پھر جب لوگ بدنام کریں تو اس کے بعد یہ شکایت کریں کہ لوگ ہم کو غلط طور پر بدنام کرتے ہیں۔ اس کے بجائے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ایسا فعل ہی نہ کیا جائے جس کی وجہ سے لوگوں کو غلط طور پر بدنام کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملہ میں یہی حکمتِ نبوی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال آج ہمارے سامنے ہے۔ سلمان رشدی نے بلاشبہ توہینِ رسول اور اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا۔ بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادئ فکر کے قاتل ہیں۔ اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔

ہمیں اس حقیقت کو جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ آزادئ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادئ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادی خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادئ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں، باعتبار نتیجہ، سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادئ فکر کا قاتل ہے، اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنتِ رسول کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو اس "بدنامی" سے بچایا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی ہو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی چیز کو برداشت کرنا پڑے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام دشمنوں کو قتل نہیں کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ کھلے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے سرگرم ہیں تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ بند ہو جائے، اس قسم کی سرگرمی بلاشبہ سرکشی ہے، اس کا

خدا اور رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔

دو اقتباس

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے مجنونانہ ایجی ٹیشن کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوا۔ البتہ اس کا یہ زبردست نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو کر رہ گیا۔ اس کی بے شمار مثالیں ۱۹۸۹ کے نصف اوّل میں سامنے آئی ہیں۔ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان میں سے دو مثال نقل کی جاتی ہے۔

"لندن کے مضافات میں مقیم ایک برطانوی نژاد نومسلم انگریز نے، جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے، لکھنؤ میں مقیم اپنے ایک دوست کو لکھا ہے کہ مجھے اپنے خاندان، رشتہ داروں، اپنے دوستوں اور اپنی پوری قوم کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آرہا ہے۔ چاروں طرف سے لوگ حملے کر رہے ہیں۔ حملے کس رہے ہیں، اور خمینی کا نام لے کر چڑھا رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انگریز قوم کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سے اتنی سخت نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس واقعہ سے پہلے جو چند ماہ میں نے اسلام لانے کے بعد یہاں گزارے تھے، ان کے دوران مجھے ایسی تلخی کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔"

ماخوذ از: ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۴-۵

۲۔ ٹائم میگزین (۱۷ اپریل ۱۹۸۹) کے دو صفحہ پر یورپ میں اسلام کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک پیرگراف یہ ہے:

The incendiary furor over Salman Rushdie and his novel *The Satanic Verses* seemed to confirm the long-standing Western stereotype of Islam as a religion of intolerance and violence. The clash in Europe was especially acute. Almost overnight, efforts to erase old perceptions were "demolished," says French historian Bruno Etienne, a scholar of Islam. "I would have preferred that instead of the screaming thousands brought to us by TV, we could have seen the hundreds of thousands of Muslims who reflect and who pray in private for an integrated Islam."

سلمان رشدی اور اس کے ناول "شیطانی آیات" پر مسلمانوں کا اشتعال انگیز

شور وغل مغرب کے اس قدیم نظریہ کی تصدیق کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام غیر رواداری اور تشدد پسندی کا مذہب ہے۔ یورپ میں ٹکراؤ خاص طور پر بہت سخت تھا۔ تقریباً راتوں رات ایسا ہوا کہ قدیم تصورات کو مٹانے کی کوششیں ملیامیٹ ہو کر رہ گئیں۔ ایک فرانسیسی مورخ برونو ایٹنی جو اسلام کا عالم ہے، اس نے کہا کہ ہزاروں لوگ جو ہم کو ٹی وی کے اوپر چیختے چلاتے ہوئے دکھائے گئے، اس کے مقابلہ میں مجھ کو یہ زیادہ پسند تھا کہ ہم ایسے ہزاروں مسلمان دیکھتے جو اپنی تنہائیوں میں اسلام کے استحکام کے لیے دعائیں کر رہے ہوتے۔ (صفحہ ۴۰)

ان دو حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے رشدی کے خلاف جو بے معنی شور وغل کیا، وہ کس طرح کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہونچا، البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب ضرور بن گیا۔

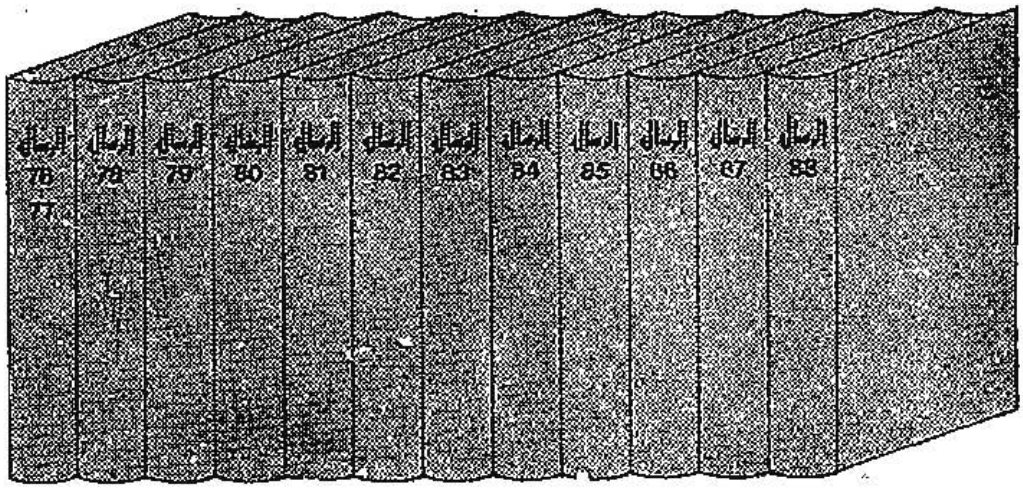

الرسالہ (مجلد)

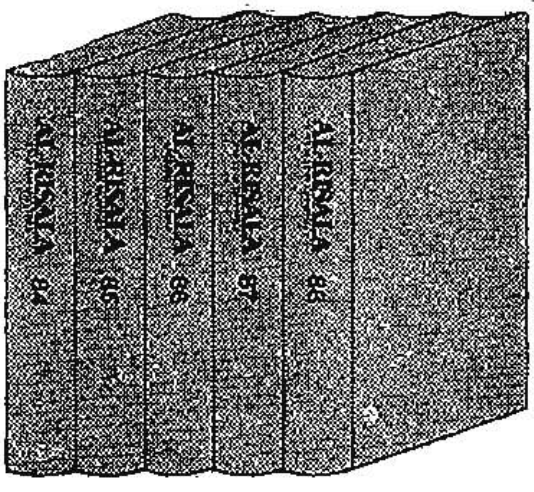

الرسالہ اردو اور انگریزی ایک، ایک سال کی فائل مجلد کروائی گئی ہے۔ فی الحال الرسالہ اردو ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے اور الرسالہ انگریزی کی مکمل فائل ۱۹۸۴ سے ۱۹۸۸ تک تیار ہے۔ ہدیہ فی جلد ۶۰ روپیہ

گارڈن گروو (Garden Grove) امریکہ کا ایک شہر ہے جو لاس انجلیز کے قریب پیسفک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اسلامک سوسائٹی یہیں پر ۱۹۶۲ میں قائم ہوئی۔ اپنے دستور کے مطابق یہ ایک غیر سیاسی (Non-political) ادارہ ہے۔ اس میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ اب وہ پانچ ایکڑ سے زیادہ بڑے رقبہ میں قائم ہے۔ اس کے اندر مسجد، کانفرنس روم، لائبریری، اسکول، وغیرہ واقع ہیں۔ اس سوسائٹی کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ہیں۔ سوسائٹی کی ہر چیز امریکی معیار کے مطابق ہے۔ اس کے اسکول کو دیکھتے ہوئے ہم ایک بند دروازہ پر پہونچے۔ معلوم ہوا کہ اس کے اندر لفٹ لگی ہوئی ہے۔ اس لفٹ پر سوسائٹی کو ۴۵ ہزار ڈالر خرچ کرنا پڑا۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ ہر اسکول جو گراؤنڈ سے اوپر ہو، خواہ وہ صرف ایک منزل ہو، اس میں لفٹ (Elevator) لگانا ضروری ہے، تاکہ معذور طالب علموں کو اوپر چڑھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

امریکہ میں معذوروں (Handicapped) کا ہر سطح پر بے حد خیال کیا جاتا ہے۔ ہر جگہ انھیں خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ یہ صرف لفظی قانون نہیں ہے، بلکہ اس پر باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا اسکول اس وقت تک منظور نہیں کیا گیا جب تک اس نے لفٹ نہ لگالی۔ اب بھی اس کا جدید ترین طرز کا "کیچن" غیر منظور شدہ ہے، کیوں کہ اس کے طعام خانہ کے دروازہ پر چوکھٹ لگی ہوئی ہے جو معذوروں کی پہیہ دار گاڑی کے بآسانی گزرنے میں رکاوٹ ہے۔ واضح ہو کہ فی الحال سوسائٹی کے اسکول میں کوئی معذور طالب علم موجود نہیں۔

اسلامک سوسائٹی میں مسلم بچوں کے لیے ایک اسکول قائم ہے۔ یہ اسکول بھی جدید معیار کے مطابق ہے۔ ایک اجلاس میں بچوں نے عربی اور انگریزی میں تقریریں کیں۔ اس طرح کے پروگرام ہندستان میں بھی مکاتب و مدارس میں کیے جاتے ہیں۔ مگر یہاں بچوں نے جس طرح تقریریں کیں، ان کا معیار ہندستانی طلبہ سے بہتر نظر آیا۔ حسان صدیقی (۱۱ سال) نے عربی میں تقریر کی۔ یہ تقریر بالکل عرب لہجہ میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عرب بچہ بول رہا ہے۔ اسلامک سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ میگزین بھی نکلتا ہے جس کا نام آرنج کریسنٹ (The Orange Crescent) ہے۔

امریکہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر چیز کا ایک اسٹینڈرڈ قائم ہو گیا ہے۔ ملک کے ایک

حصہ میں چیزوں کا جو معیار ہے، وہی آپ کو پورے ملک میں نظر آئے گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے امریکہ کے ایک شہر کو دیکھا ہو تو آپ نے تمام شہروں کو دیکھ لیا:

If you have seen one city, you have seen them all.

اس ماحول کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں جو اسلامی کام ہو رہے ہیں، وہ بھی، کم از کم ظاہر کے اعتبار سے، جدید معیار کے مطابق ہیں۔ ہندستان میں ہمارے بزرگوں نے دعوت کا کام زیادہ تر پست طبقات میں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اسلام کا معیار بھی پست ہو گیا۔ امریکہ میں عمومی طور پر پست و بلند کا یہ فرق نہیں ہے، اس لیے یہاں اسلام کا کام کرنے والوں کو بھی اپنا معیار بلند رکھنا پڑتا ہے، ورنہ یہاں کے ماحول میں وہ بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

امریکہ میں بڑی تعداد میں ایسے مراکز قائم ہیں جن کو یہاں کی اصطلاح میں "اسلامک سنٹر" کہا جاتا ہے۔ ہندستانی اصطلاح میں ان کو وسیع تر مسجد کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں مرکزی طور پر ایک مسجد ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے تعلیمی اور ثقافتی شعبے بھی۔ یہ مراکز یہاں کے مسلمانوں کے لیے نقطۂ اتحاد یا اجتماعی شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس قسم کے ایک مرکز کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں کے وابستہ مسلمانوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں میں نے لوگوں کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ اتحاد کی واحد قیمت اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔ اس سلسلہ میں صحابہ کرام کی بہت سی مثالیں دیں (اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے)

تقریر کے بعد بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ "اختلاف کے باوجود اتحاد" کا یہ نظریہ ابھی تک ہم کو بتایا ہی نہیں گیا۔ حالاں کہ اس معاملہ میں اہم ترین بات یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ مشرق کے مسلمان ہوں یا مغرب کے مسلمان، سب کی واحد کمی یہ ہے کہ ان میں حقیقی شعور موجود نہیں۔ ہمارے علماء اور قائدین خود ہی بے شعوری کا شکار ہیں، پھر وہ دوسروں کو کس طرح شعور دے سکتے ہیں۔

اسلامک سوسائٹی (آرنج کاونٹی) کے علاقہ میں تقریباً ۴۰ ہزار مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم ان میں بمشکل دس فیصد ایسے مسلمان ہوں گے جو اسلامک سوسائٹی سے وابستہ ہوں۔ میں نے سوسائٹی

کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کے پاس ایک بار کسی دور کے شہر سے ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ اقبال نے معذرت کرتے ہوئے لکھا ـــــــ اقبال خانہ نشیں ہے۔ اور موجودہ طوفان کے زمانہ میں اپنے گھر کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے۔

میں نے کہا کہ امریکہ (اور دوسرے مغربی ملکوں) میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اور ان کی نسلیں ایک کلچرل طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے طوفانی سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں "اسلامک سوسائٹی" جیسا مرکز ان کے لیے کشتیٔ نوح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر جگہ ایسے اسلامی مراکز قائم کریں، اور جہاں وہ قائم ہیں وہاں انھیں مضبوط کریں اور ان سے وابستہ رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ جو لوگ ان مرکزوں سے علٰحدہ رہیں گے ان کے لیے اندیشہ ہے کہ وہ فکان من المغرقین (ہود ۴۳) کا مصداق ثابت ہوں۔

امریکی براعظم کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کو ساؤتھ امریکہ اور دوسرے کو نارتھ امریکہ کہا جاتا ہے۔ نارتھ امریکہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اگر صرف لفظ "امریکہ" بولا جائے تو اس سے یہی نارتھ امریکہ مراد لیا جاتا ہے۔ میرا موجودہ سفر نارتھ امریکہ میں ہوا جس کو زیادہ صحیح طور پر یو ایس یا یو ایس اے کہا جاتا ہے۔ امریکہ (یونائیٹڈ اسٹیٹس) کا رقبہ ۹۳۶۳۴۰۵ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ رقبہ انڈیا کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہے۔

"امریکہ ایک خوش قسمت ملک ہے" ایک صاحب نے کہا "امریکہ میں ہر قسم کے قدرتی ذرائع وافر مقدار میں موجود ہیں، اور یہی اس کی غیر معمولی ترقی کا راز ہے۔" میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ امریکہ نے اگر ذرائع کی فراوانی کے بل پر ترقی کی ہے تو جاپان کی ترقی کے بارہ میں آپ کیا کہیں گے جہاں قدرتی ذرائع نایابی کی حد تک کم ہیں۔ سیاسی حالات کا غیر موافق ہونا اس پر مزید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جاپان کا ظاہرہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی محنت اور دانش مندی ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ وہ ہر دوسری چیز پر بالا ثابت ہوتی ہے۔

اینڈریو کلگور (Andrew Killgore) یہاں کی ایک مشہور شخصیت ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی مہاجر کمیونٹی کے ایک اجتماع میں تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ کسی بھی سماج میں سب سے زیادہ محنت سے کام کرنے والے لوگ مہاجر ہیں:

The hardest working people in
any society are the immigrants.

امریکہ جیسے ملک میں جو حیثیت مہاجر کی ہے، وہی ہندستان جیسے ملک میں اقلیتی فرقہ کی ہے۔ ایک اعتبار سے، دونوں ہی اقلیت کا کیس ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی "اقلیت" زیادہ محنت کے ذریعہ اپنے کامیاب مستقبل کی تعمیر کر رہی ہے، اور ہندستان کی "اقلیت" محنت کے راستہ کو چھوڑ کر احتجاج اور مطالبہ کا ناکام راستہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ امریکہ جیسے ملکوں کی "اقلیتیں" اپنی فطرت پر ہیں۔ یہ فطرت کا سکھایا ہوا سبق ہے کہ جہاں کم مواقع ہوں، وہاں زیادہ محنت کرو۔ چنانچہ یہ لوگ فطرت کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں کہ محنت کی زیادتی سے مواقع کی کمی کی تلافی کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندستان جیسے ملکوں میں فطرت اور انسان کے درمیان ایک مصنوعی پردہ حائل ہو گیا ہے۔ یہ نام نہاد لیڈروں کا پردہ ہے۔ لیڈروں نے مسلسل جھوٹا سبق پڑھا کر یہاں کے انسان کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیا ہے۔ ہندستان کی اقلیت کو اگر اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو وہ بھی اپنی فطرت کے زور پر وہی طریقہ اختیار کر لیتی جو امریکہ کی اقلیت نے اختیار کیا۔

امریکی اقلیت کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی رہنما خدائی فطرت ہے، ہندستانی اقلیت کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے رہنما جھوٹے انسانی لیڈر ہیں۔ انھیں دو لفظوں میں دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے فرق کا راز چھپا ہوا ہے۔

امریکہ کی آبادی ڈھائی سو ملین (۲۵ کروڑ) ہے۔ اس میں چھ ملین یہودی ہیں۔ کل آبادی کا تین فی صد۔ اس اعتبار سے وہ یہاں کی ایک بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ مگر امریکی یہودی اپنے کو اقلیت نہیں سمجھتے۔ امریکی نظریہ کے مطابق، وہ مختلف مگر برابر (Different but equal) کے اصول کو مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اقلیت محض کوئی عددی معاملہ نہیں۔ وہ دراصل ایک ذہنی حالت کا نام ہے:

Minority is a state of mind.

ہندستان میں بھی آپ کو ایسے مسلمان ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ ہم اس ملک میں اقلیت نہیں ہیں، ہم یہاں کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمان کی یہ بات محض ایک لفظی فخر ہے۔ جب کہ امریکی یہودی کی مذکورہ بات مواقع کار کو بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی مسلمان ہندستان میں اقلیت والے حقوق بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس امریکی یہودی امریکہ کے ان مناصب پر قبضہ کیے ہوئے ہیں جو عام حالات میں صرف اکثریت کا حصہ ہوتے ہیں۔

لی آیاکوکا (Lee Iacoca) امریکہ کی تجارتی دنیا میں افسانوی شخصیت (Legend) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ کو امریکہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تجارت کے میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور نیویارک سے چھپی ہے۔ یہاں میں نے یہ آپ بیتی دیکھی۔ اس کا نام ہے :

IACOCA: An Autobiography, 1984

انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ آدمی چلتا رہے حتی کہ برے وقتوں میں بھی۔ آدمی مایوس نہ ہو، حتی کہ اس وقت بھی جب کی اس کی دنیا منہدم ہو رہی ہو۔ میں نے سخت محنت کی اہمیت کو جانا۔ آخر کار آپ کو مفید بننا چاہیے :

I learned to keep going, even in bad times. I learned not to despair, even when my world was falling apart. And I learned about the value of hard work. In the end, you've got to be productive.

اپنی زندگی کی کہانی بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ کیسے یہاں تک پہونچے۔ میں وہی جواب دیتا ہوں جو میرے والدین نے مجھے بتایا تھا ——— اپنے آپ کو استعمال کرو :

People say to me: "You're a roaring success. How did you do it?" I go back to what my parents taught me. Apply yourself (p. 340).

امریکہ کے معمار اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا راز یہ بتاتے ہیں کہ اپنے آپ کو استعمال کرو

اس کے برعکس ہندستان کے مسلم لیڈر اپنے ہم قوم لوگوں کو یہ جھوٹا سبق سکھا رہے ہیں کہ دوسرے کے خلاف حقوق طلبی کی مہم چلاؤ۔

ہندستان میں تجارت کا مطلب لوٹ ہوتا ہے۔ یہاں میں کسی کے پاس ملکی صنعت کی بنی ہوئی کوئی چیز دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو: ایک مرتبہ تو میں پھنس گیا، مگر دوبارہ میں پھنسنے والا نہیں۔ ہندستان میں آدمی قیمت دے کر بھی اپنی مطلوب چیز کو نہیں پاتا۔

امریکہ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آئی۔ یہاں ہر چیز سائنس کے جدید معیار پر بنائی جاتی ہے۔ ہینڈ بیگ سے لیکر کار تک، اور ٹیلی فون سے لیکر دستی گاڑی تک ہر چیز عین وہی ہے جیسا کہ معیار کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔ یہاں کا گاہک ضروری قیمت دینے کے بعد ہمیشہ اپنی مطلوب چیز کو پالیتا ہے۔

یہ فرق دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان میں بھری ہوئی سیٹوں کے درمیان ایک عظیم الشان سیٹ ابھی خالی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کوئی آکر وہاں بیٹھے۔ یہاں تجارتی لوٹ کی جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر تجارتی تبادلہ کی جگہ ابھی تک خالی ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائیں اور مشترکہ سرمایہ کے ذریعہ مختلف صنعتیں کھولیں جہاں سستے سامان بنانے کے بجائے حقیقی مطلوبہ معیار کے مطابق چیزیں بنائی جائیں تو وہ زبردست کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ ہندستان کے وسیع جغرافیہ میں وہ اپنا ایک "امریکہ" بنا سکتے ہیں۔

امریکی ایک بہت خرچ کرنے والی قوم ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت جاپانی اپنی آمدنی کا ۱۸ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ جب کہ امریکی اپنی آمدنی کا صرف ۳ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ بچت (Individual savings) کے اعتبار سے اس وقت جاپانی سب سے زیادہ بچانے والی قوم ہیں۔ ۱۹۸۸ میں جاپانیوں کے سیونگ اکاونٹ میں مجموعی طور پر جو رقم تھی۔ اس کی مقدار ۵۰۰۰ بلین ڈالر ہے۔

امریکیوں کی اسی خصوصیت کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں ہر قسم کی سرگرمیاں شباب پر نظر آتی ہیں۔ کوئی بھی غلط یا صحیح کام کیجیے، وہاں آپ کو مالی تعاون کرنے والے مل جائیں گے۔ خیراتی کاموں

میں رقم دینے والے امریکہ میں سب سے زیادہ ہیں۔ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو سب سے زیادہ امداد امریکہ سے ملتی ہے۔ ہندو گروؤں کو سب سے زیادہ تعاون امریکہ سے ملا ہے۔ انگریزی اسلامی لٹریچر کا سب سے بڑا مارکیٹ امریکہ ہے، وغیرہ۔ بعض لوگ اس کی شکایت کرنے والے ملے کہ امریکہ کے لوگ بے فائدہ کاموں میں بہت زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ امریکہ میں فائدہ والے کاموں کے لیے بھی بہت زیادہ تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔

مغربی دنیا میں امریکی لوگ سب سے زیادہ مذہبی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً فرانس میں صرف ۵ فی صد لوگ چرچ جاتے ہیں۔ انگلینڈ میں ۱۰ فی صد۔ مگر امریکہ میں چرچ جانے والوں کی تعداد ۵۰ فی صد ہے۔ امریکہ غالباً واحد ملک ہے جس کی کرنسی (ڈالر) پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہوتا ہے:

In God we trust

ایک طرف امریکہ میں اگر جنسی آزادی اور اس قسم کی دوسری برائیاں عروج پر ہیں تو دوسری طرف ان کے یہاں مذہبی مزاج بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ اگر امریکی سماج کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو یہاں اسلامی دعوت کے مواقع نہایت روشن نظر آئیں گے۔

یہاں اگر آپ صبح کے وقت کسی سڑک پر نکلیں تو ہر گھر کے سامنے آپ کو پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلے رکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان تھیلوں کے اندر گھر کا کوڑا بھرا ہوتا ہے۔ سرکاری گاڑیاں ان کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پھر خاص قسم کی مشینوں میں رکھ کر انھیں دبایا جاتا ہے تو ان کا حجم بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کو ٹھکانے لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں یہ کام ایک مستقل فن بن چکا ہے جس کو گاربالوجی (Garbology) یا ویسٹ مینجمنٹ (Waste management) کہا جاتا ہے۔

اس فن میں تازہ ریسرچ اس بات پر ہو رہی ہے کہ کوڑے کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لیے کیا کیا جائے۔ یہ ریسرچ اب کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ آئندہ یہ ممکن ہو سکے گا کہ سیور گیس (Sever gas) سے ڈائمنڈ بنایا جا سکے۔ امریکی بحریہ کے سائنس دانوں نے حال میں اس کا دعوی کیا ہے۔ ایک شخص نے اس کو بتاتے ہوئے کہا:

That's the most recent claim of US naval scientists.

امریکہ کے حالیہ الکشن (۱۹۸۸) میں جو لوگ صدارت کے امیدوار تھے، ان میں مسٹر گیری ہارٹ (Gary Hart) کا نام ابتداءً سر فہرست تھا۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی بنا پر پیشین گوئی کی جارہی تھی کہ اگلی میعاد کے لیے وہی صدر منتخب ہوں گے۔ مگر الکشن سے پہلے یہاں کے بعض اخباروں نے مسٹر ہارٹ کی ایک تصویر چھاپ دی جس میں وہ امریکہ کی ایک فلم ایکٹرس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ اخباروں نے انکشاف کیا کہ مسٹر ہارٹ نے ڈونا رائس کے مکان میں رات گزاری ہے۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ کی مقبولیت اچانک ختم ہوگئی۔ حتی کہ انھیں صدارت کی امیدواری سے اپنا نام واپس لینا پڑا۔

اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ نومبر ۱۹۸۸ کے الکشن کے موقع پر بھٹو پارٹی کے اسلامی مخالفین نے ایک تصویر چھاپی جس میں مسز نصرت بھٹو کو امریکہ کے سابق صدر مسٹر فورڈ کے ساتھ ناچتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پاکستان بھر میں پھیلا دیا گیا۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پاکستانی عوام نے بھٹو پارٹی کے حق میں ووٹ دے کر بے نظیر بھٹو کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا ——— اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک کا یہ فرق بھی کیسا عجیب ہے۔

ایک خبر پڑھی۔ اس میں بیل گاڑی کے بارہ میں ایک "نئی دریافت" کا ذکر تھا۔ ترقی پذیر ملکوں میں جانوروں کے ذریعہ کھینچی جانے والی گاڑیوں میں ٹائر لگانے سے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ یہ گاڑیاں ہلکی چلتی ہیں اور ان میں زیادہ سامان ڈھویا جاسکتا ہے۔ مگر دیہاتی علاقوں میں کچی سڑکوں کی وجہ سے ان کے ٹائر اکثر اوقات پنکچر ہو جاتے ہیں اور پھر ان میں دوبارہ ہوا بھرنا اور قابل استعمال بنانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ان ٹائروں میں ہوا کی جگہ لکڑی کا بھوسہ بھرنے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان ٹائروں کے پنکچر ہونے کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ گاڑیاں تقریباً دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتی ہیں اور ان میں ۵۰۰ کلو گرام سامان لادا جاسکتا ہے۔ یہ "دریافت"

اقوام متحدہ کے ادارۂ زراعت کے تحت کی گئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں کار اور ہوائی جہاز سے لیکر جدید قسم کی بیل گاڑی تک اکثر چیزیں وہ ہیں جو امریکہ سے دنیا کو ملی ہیں۔ امریکہ کا یہی تخلیقی عمل ہے جس نے اسے جدید دنیا میں برتر مقام دیدیا۔ اس کا سبب وہ "سازشیں" نہیں ہیں جو ہم نے اس لیے دریافت کر رکھی ہیں تاکہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی پسماندگی کو خود اپنی نااہلی کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے دوسروں کی نالائقی کے خانہ میں ڈال سکیں۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے جولائی ۱۹۶۵ کا ایک تجربہ ان الفاظ میں لکھا تھا ــــ "ایک دن دوپہر کی گاڑی سے کلیفورنیا یونی ورسٹی کے ایک استاد بے شان و گمان دریاباد پہنچے۔ اور دو ڈھائی گھنٹے کے سوال وجواب کے بعد واپسی کی ٹرین سے واپس ہو گئے امریکہ کے صاف و شفاف بلوری سڑکوں کا عادی ہمارے قصبات کی ادھ پکی کھانچوں اور گڑھوں سے بھری ہوئی سڑکوں کا تصور بھی نہ کر سکتا ہوگا۔ اور پھر موٹر نشیں امریکی کے ذہن میں کھڑکھڑے چرخ چوں ایکوں کی تصویریں بھی کیوں آنے لگیں تھیں۔ اور یہ تجربہ بالکل انوکھا نہیں۔ ایک اور امریکی پروفیسر خاک پھانکتے آج سے چند سال قبل بھی آچکے تھے۔ ایسے اعجوبہ سفر سے بڑھ کر اعجوبہ سفر بھی غرض و غایت نکلا۔ موضوع مطالعہ و تحقیق ہندستان میں تحریک خلافت کی تاریخ (تقریباً ۱۹۲۹ - ۱۹۱۹) اسی ایک کام کے لئے امریکہ سے ہندستان، پاکستان کا سفر۔ اور مدراس، بنگلور، دہلی، حیدرآباد، کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، کراچی وغیرہ کے علاوہ دریاباد تک کی پرمشقت مسافت۔ اور عین اسی زمانہ میں ایک دوسرے امریکی ریسرچ اسکالر اپنا موضوع لئے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکات (۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۲۰ تک) ہندستان کی خاک چھان رہے ہیں۔ اور دریاباد آنے پر ہر وقت آمادہ۔ لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے یہیں کے حقیر ذخیرۂ معلومات (کامریڈ وغیرہ کی جلدوں) سے کام لے رہے ہیں (صدق جدید ۱۲ اگست ۱۹۶۵)

یہ اس قسم کی بے شمار مثالوں میں سے ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی قومیں کس طرح ہر قسم کے احوال سے اپنے کو باخبر رکھتی ہیں تاکہ ان کی پلاننگ صحیح ہو۔ قدیم زمانہ میں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سارے یوروپ میں نئے قسم کے اہل علم جاگ اٹھے جن کو مستشرق کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مشرقی اقوام (بشمول مسلمان) کی اتنی کامل تحقیق کی کہ ان کے بارے میں خود مشرقی اقوام سے زیادہ واقف اور باخبر ہو گئے۔ اس واقفیت سے انھوں نے زبردست فائدہ اٹھایا جس

کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

صلیبی جنگوں جیسا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ برعکس صورت میں پیش آیا۔ مگر موجودہ پورے دور میں مسلمانوں میں کوئی بھی مثال نہیں ملتی جب کہ مسلم اہل علم نے مغربی اقوام کی برتری کا راز سمجھنے کے لئے حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ کوشش کی ہو۔

سیٹل (Seattle) میں امریکہ کی مشہور جہاز ساز کمپنی بوئنگ (Boeing) کا پلانٹ ہے جس کی ورک فورس (Workforce) ۹۶ ہزار ہے۔ یہ اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جو امریکی معیار کے ۵۷ فوٹ بال فیلڈ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اگر آپ وہاں جائیں تو وہاں ایک شاندار بورڈ پر آپ کو یہ الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے کہ جس طرح ہیرا تراشنے والا ہیرے کو تراشتا ہے، اسی طرح ہمارے ماہر کاریگر ہر جہاز کو درست کرتے ہیں اور حد درجہ صحت اور تفصیل کے ساتھ اس کو تیار کرتے ہیں :

Just as the diamond cutter strikes the stone, so our skilled workers assemble and carefully inspect each airplane with precision and detail.

ابتداءً بوئنگ کمپنی میں کام کا معیار ایسا ہی تھا۔ مگر اب اس کا سابقہ معیار باقی نہیں رہا ہے۔ ۱۹۸۸ میں بوئنگ کے ایک درجن سے زیادہ جہازوں کے ساتھ چھوٹے یا بڑے حادثات پیش آئے۔ چنانچہ اب بوئنگ کمپنی کی ساکھ (Reputation) بہت گر گئی ہے۔ آبزرور (The Observer) کی ایک تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان ہوائی حادثات کا سبب زیادہ تر بناوٹ کی خامیاں (Manufacturing errors) تھیں ——— الفاظ میں اعلیٰ معیار مقرر کرنا بے حد آسان ہے، مگر عمل میں اس کو مسلسل طور پر برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔

امریکہ نے ایک شٹل خلا میں بھیجی جس کا نام چیلنجر (Challenger) تھا۔ یہ شٹل دو ملین میل کا سفر طے کر کے ۹ اپریل ۱۹۸۳ کو زمین پر واپس آگیا۔ اس میں دو خلائی کاریگر (Orbital repairman) اوپر بھیجے گئے تھے۔ ان دونوں کے جسم پر ۲۵۰ پونڈ وزن کا خلائی سوٹ تھا۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت دو ملین ڈالر سے زیادہ تھی۔ وہ زمین سے ۱۷۶ میل کی دوری پر اپنے جہاز سے باہر نکلے اور چار گھنٹہ تک خلا میں رہے اور ایک مواصلاتی سٹلائٹ کی مرمت کا کام کر کے دوبارہ اپنے کیبن میں

واپس آگیے۔

امریکی خلاباز جس وقت زمین سے پونے دوسو میل کی بلندی پر "تاریخ کا پہلا خلائی کارنامہ" انجام دے رہے تھے، اس وقت سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن نے اپنے زمینی دفتر میں بیٹھے ہوئے ان سے بات کی۔ صدر نے ان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ یہ خلائی شٹل ہمارے اس عہد کی ایک علامت ہے کہ ہم خلا میں امریکی بالاتری کو باقی رکھیں گے:

The space shuttle is a symbol of our commitment to maintain America's leadership in space. *Herald Tribune,* London, April 10, 1983.

اب پانچ سال بعد امریکہ کی خلائی بالاتری کا افسانہ ختم ہو رہا ہے۔ خلائی بالاتری کا منصوبہ امریکہ کے لیے اتنا مہنگا پڑا کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ انسان اپنی محدودیت کو نہیں جانتا۔ اگر وہ اپنی محدودیت کو جانے تو ہرگز وہ بڑی بڑی باتیں نہ کرے۔

ایک خبر اخبار میں نظر سے گذری ——— امریکہ اور فلپائن کی حکومت کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے جس کے تحت واشنگٹن نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ فلپائن میں اپنے چھ فوجی اڈوں (Military bases) کے استعمال کے لیے پانچ کرور ڈالر سالانہ معاوضہ ادا کرے گا۔ یہ معاہدہ ۱۹۹۱ تک نافذ رہے گا۔ ان میں ایک فضائی اڈہ، ایک بحری اڈہ، اور چار نسبتاً چھوٹی تنصیبات شامل ہیں۔ امریکہ یہ سالانہ معاوضہ معاشی امداد، فوجی تعاون اور اشیاء کی فراہمی کی صورت میں ادا کرے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ وہ عالمی قیادت حاصل کرے۔ وہ اس کی بے حد مہنگی قیمت مسلسل دیتا رہا ہے۔ مذکورہ خبر اس کی محض ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مگر امریکہ کے مدبرین اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ پالیسی قابل عمل نہیں۔ ایک امریکی لیڈر نے کہا کہ ایک خاندان کی طرح ایک سماج بھی اپنے ذرائع سے باہر جا کر غیر محدود طور پر زندہ نہیں رہ سکتا:

A society, like an individual family, cannot live beyond its means indefinitely.

اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ غیر اسلام احساس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور اسلام احساس خداوندی کی زمین پر۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس آج دونوں میں سے کوئی زمین موجود نہیں۔ اور بلاشبہ یہی ان کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

نومبر ۱۹۸۸ میں امریکہ میں جو صدارتی الکشن ہوا ہے، اس میں جارج بش (George Bush) کو امریکہ کے صدر کی حیثیت سے چنا گیا ہے۔ ایک خبر پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ مسٹر جارج بش کا ایڈمنسٹریشن امریکہ کی اقتصادی پالیسی میں اہم تبدیلیاں لا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ اب تک یورپ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا رہا ہے۔ مگر نئے فیصلہ کے تحت ایشیا کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اس کا سبب ایشیا سے ہمدردی نہیں، بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔

نئے ایڈمنسٹریشن کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۷ میں امریکہ کی تجارت یورپ سے تقریباً ۱۷۰ بلین ڈالر کے بقدر تھی جب کہ اسی مدت میں ایشیا سے امریکہ کی تجارت ۲۴۱ بلین ڈالر رہی۔ ۱۹۸۸ میں بھی یہی تناسب مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔

باشعور لوگ ہمیشہ اپنے عمل کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر کے اپنے عمل کا رخ بدل لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ بے شعور ہوں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار وہ جس ڈگر پر چل پڑیں، بس اسی ڈگر پر وہ بے سوچے سمجھے چلتے رہتے ہیں، ان کی آنکھ صرف اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ بربادی کے گڑھے میں گر کر اصلاح حال کا آخری موقع کھو چکے ہوں۔

امریکہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بے قید آزادی ہے۔ اس بے قید آزادی کا سب سے زیادہ اظہار جنسی معاملات میں ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی کم سن لڑکیوں میں، دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں، اسقاط کی شرح سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یورپی قوموں کے مقابلہ میں تقریباً دگنا زیادہ۔ ۱۵ سے ۱۹ سال کی عمر کی امریکی عورتیں تقریباً دس فی صد کی تعداد میں ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں:

American teenage girls have the highest rate of abortion in the developed world, more than double that of most European nations. About 9.8 per cent of American women aged 15 to 19 become pregnant annually, the highest rate among the nations studied.

بیسویں صدی میں ایک طرف امریکہ میں آزاد زندگی کا تجربہ کیا گیا، اور دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کا۔ امریکہ میں آزاد نظام کے تجربہ نے اس کو برباد کن اباحیت تک پہونچا دیا۔ یہاں تک کہ خود امریکہ میں بی ایف اسکنر (B.F. Skinner) جیسے لوگ پیدا ہوئے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے:

We can't afford freedom

دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کو قائم کرنے کی کوشش کا یہ بھیانک انجام ہوا کہ سابق روسی وزیر اعظم جوزف اسٹالن نے ۱۲ ملین آدمیوں کو مار ڈالا، مجموعی طور پر ۳۸ ملین آدمی اس کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ یہ اعداد و شمار خود روسی مورخ میڈویڈیو (Roy Medvedev) نے "ماسکو نیوز" میں شائع کیے ہیں (کلیرٹی ۴ دسمبر ۱۹۸۸) چنانچہ موجودہ روسی وزیر اعظم میخائیل گورباچوف کو اعلان کرنا پڑا کہ "ہم پابند زندگی کا تحمل نہیں کر سکتے"۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہنمائی کے بغیر جب بھی انسانی زندگی کا نقشہ بنایا جائے گا، وہ یا تو ایک انتہا کی طرف جائے گا یا دوسری انتہا کی طرف۔ وہ کبھی معتدل اور متوازن نقشہ نہیں ہو سکتا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رونالڈ ریگن نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت میں امریکہ کو کوئی ترقی نہیں دی، البتہ اس کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ ریگن نے، بظاہر اپنی ذاتی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے ستارہ کی جنگ (Star wars) کا نعرہ لگایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی جنگی ٹکنالوجی تیار کی جائے کہ دشمن کے حملہ کا مقابلہ زمین سے اوپر ہو سکے اور اس کو خلا کے اندر ہی برباد کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ریسرچ اور تجربات کا خرچ اتنا بڑھ گیا کہ امریکہ جو دنیا کو قرض دیتا تھا، وہ خود سب سے بڑا مقروض ملک بن گیا۔ اس وقت (۱۹۸۸ کے آخر تک) امریکی قرضہ دو کھرب ساٹھ ارب ڈالر تک پہونچ چکا ہے۔ صرف جاپان کا قرضہ اس کے اوپر ۱۵ ارب بیس کروڑ ڈالر ہے۔ اس وقت امریکی انتظامیہ کے اخراجات اس کی آمدنی سے بہت زیادہ ہیں۔ مختلف ملکوں کا سرمایہ جو اس وقت امریکہ کے بینکوں میں ہے، اگر وہ اس کو نکال لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہو جائے گا۔ دنیا کے دس بڑے بینکوں میں صرف ایک امریکی بینک ہے، باقی سب جاپانی بینک ہیں۔ پہلے یہ حال تھا کہ دنیا بھر میں جتنی کاریں تیار ہوتی تھیں، ان کا ۷۵ فیصد امریکہ تیار کرتا تھا۔ اب صرف ۲۵ فی صد کاریں یہاں

تیار ہو رہی ہیں۔ ۱۹۷۲ میں دنیا کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کا ۷۰ فی صد امریکہ میں تیار ہوتا تھا۔ اب اس کی مقدار صرف ۳۰ فی صد رہ گئی ہے۔

کوئی شخص یا قوم خواہ وہ کتنا ہی زیادہ طاقتور ہو، اس کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ طاقت کے اندر اقدام کرنا کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور طاقت کے باہر اقدام کرنا بربادی کی طرف۔

ایک لطیفہ پڑھنے کو ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت کیوں کم ہو گئی ہے۔ اگر سب نہیں تو کم از کم ایک وجہ یقیناً یہی ہے جو اس لطیفہ میں بتائی گئی ہے۔

۸۶ سال کی ایک بوڑھی عورت پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اس نے دورانِ پرواز جہاز کے عملہ کی طرف سے ایک اعلان سنا: آپ کا کیپٹن آپ سے ہم کلام ہے۔ بعض مشینی خرابی کی وجہ سے ہمارے چوتھے انجن نے کام چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تین انجن کے ذریعہ اپنی پرواز جاری رکھیں گے اور وقت پر اپنی منزل پر اتر جائیں گے۔ مزید میرے پاس آپ کے لیے کچھ قابل اطمینان خبر بھی ہے۔ ہم اپنے ساتھ جہاز میں چار پادری رکھتے ہیں۔ بوڑھی خاتون جو اعلان کو بغور سن رہی تھی، اس نے جہاز کے عملہ کے ایک شخص کو بلا کر کہا: براہ کرم کیپٹن سے یہ کہدیں کہ میں اس کو زیادہ پسند کروں گی کہ ہمارے پاس چار انجن ہوں اور تین پادری:

An 86-year-old woman who was flying for the first time heard the following announcement come over the plane's intercommunication system. "This is your captain speaking. Our number four engine has just been shut off because of mechanical trouble. However, there is nothing to worry about. We will continue our flight with three engines and will land on schedule. Also, I have some really reassuring news for you. We have four priests on board."
The elderly passenger, who had been listening apprehensively, called the flight attendant. "Would you please tell the captain," she said, "that I would rather have four engines and three priests."

یہ لطیفہ دورِ جدید کے ایک اہم پہلو کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ مشینی زمانہ ہے۔ آج ہر چیز کا تعلق مشین سے ہو گیا ہے، خواہ سفر کرنا ہو یا گھر کے اندر کھانا پکانا یا اشیاء صرف کو تیار کرنا ہو۔ قدیم روایتی دور میں ان چیزوں کے لیے مشینی ماہرین کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آج ہر چیز کا تعلق مشینی ماہرین سے ہو گیا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت گھٹادی

اور مشینی طبقہ کی اہمیت کو لوگوں کی نظر میں بڑھا دیا۔ کیوں کہ دور جدید کی مشینیں مشینی ماہرین سنبھالتے ہیں نہ کہ مذہبی ماہرین۔

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام، امریکہ میں مغلوب ہو گیا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو مسلمان امریکہ آئے، وہ ابتداءً اپنے ساتھ اسلامی تہذیب لے کر آئے تھے۔ اس طرح یہاں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا مقابلہ پیش آیا۔ اس مقابلہ میں مغربی تہذیب برتر ثابت ہوئی۔ کیوں کہ ان مسلمانوں کی اکثریت نے اب اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اختیار کر لیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کو بتانے کے لیے زیادہ صحیح لفظ یہ ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ یہاں جو مقابلہ پیش آیا وہ اصول پسندی اور خواہش پرستی کے درمیان تھا۔ اسلام اصول پسند زندگی کا نمائندہ تھا، اور مغربی تہذیب خواہش پرست زندگی کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اور ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ انسان اس معاملہ میں ہمیشہ کمزور واقع ہوا ہے، وہ اصول پسندی کو چھوڑ کر خواہش پرستی کی طرف جھک جاتا ہے۔

یہ تصادم امریکہ میں نہیں بلکہ ہر جگہ جاری ہے۔ جہاں بھی آدمی کو موقع مل رہا ہے۔ وہ اصول کو چھوڑ کر خواہش کو اختیار کر لیتا ہے۔ امریکہ میں یہ واقعہ تہذیب کے انداز میں ہو رہا ہے اور دوسرے مقامات پر عمومی انداز میں۔

ایک صاحب نے اپنی گفتگو میں مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی مسلمان دنیا میں غالب اور فاتح حیثیت رکھتے تھے، آج مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے، مگر آج ہمارا حال یہ ہے کہ دنیا پر اثر انداز ہونا تو درکنار دوسرے لوگ ہمارے قومی فیصلے کرتے ہیں، آج ہم اپنی قسمت کے مالک نہیں:

We are not the master of our destiny

موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر جگہ مسلمان اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ حالت کا تقابل ماضی کی فاتحانہ حیثیت سے کرتے ہیں، وہ اپنا تقابل داعیانہ حیثیت سے نہیں کرتے۔ مسلمان اگر اپنی موجودہ حیثیت کا تقابل ماضی کی داعیانہ تاریخ سے کریں تو ان کے اندر دعوتی عمل کا جذبہ بیدار ہوگا۔ مگر ماضی کی فاتحانہ تاریخ سے تقابل ان میں کسی صحت مند جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

۲۷ دسمبر کو صبح ساڑھے دس بجے کا وقت ہے۔ صاف آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ موسم نہایت خوش گوار ہے۔ میں کوسٹامیسا (Costa Mesa) کے پارک (Wakeham Park) میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوں۔ پارک کے اندر کے مناظر، باہر کا ماحول اور اطراف کی سڑکیں اور مکانات، ہر چیز اتنی باقاعدہ اور اتنی منظم دکھائی دیتی ہے کہ دیر تک سوچنے کے باوجود مجھے وہ الفاظ نہیں ملے جن سے میں اس کی تصویر کشی کر سکوں۔

مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا۔ انھوں نے ایک بے نمازی نوجوان کو دیکھ کر کہا تھا کہ میرے بیٹے نماز پڑھا کرو تاکہ آخرت میں تمہارا خوبصورت چہرہ آگ میں نہ جلایا جائے۔ امریکہ کی خوبصورت زندگی اور یہاں کے بارونق تمدن کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے سوچا کہ کاش اللہ کے کچھ بندے اٹھیں اور یہاں کے انسانوں کو اللہ کے دین پر لانے کی کوشش کریں تاکہ ان کی نسلیں اگلی دنیا میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں۔ اس دعا کے سوا مجھے کوئی اور لفظ نہیں ملا جس کو میں یہاں درج کروں۔

امریکہ میں بہت سے "قابل دید" مقامات ہیں۔ لوگوں نے کئی جگہوں پر لے جانے کی پیش کش کی مگر میں کہیں نہ جا سکا۔ البتہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۸ کو یہاں کا مشہور ڈزنی لینڈ (Disnyland) دیکھا۔ یہ ایک تفریح گاہ یا تماشائی پارک (Amusement park) ہے۔ اس کو ابتداءً والٹ ڈزنی نے بنایا تھا اور ۱۹۵۵ میں اس کا افتتاح ہوا۔ بہت بڑے رقبہ میں طرح طرح کی عجیب چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر لوگ حیرت اور مسرت میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش کن مقام (Happiest place on earth) کہا جاتا ہے۔ اس کا ٹکٹ فی کس ۲۵ ڈالر ہے۔ دنیا بھر کے بے شمار لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں ہر روز میلے جیسی بھیڑ ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس قسم کے دو پارک بنائے گیے ہیں۔

ڈزنی لینڈ میں ایک طرف حال اور مستقبل کی دنیا کے پُر عجوبہ مناظر ہیں۔ دوسری طرف اس میں سفر کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی ایک ٹرین بنائی گئی ہے جو پانی اور کوئلے سے چلتی ہے، اور سیٹی کے بجائے اس میں قدیم طرز کا گھنٹہ ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ تاہم مجھے ڈزنی لینڈ سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو سکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈزنی لینڈ کی واقعی اہمیت اس سے بہت کم ہے جتنی اس کی

پبلسٹی کی گئی ہے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی اہمیت کی چیز کو شہرت نہیں ملتی۔ البتہ غیر حقیقی اہمیت والی چیزیں بہت زیادہ شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔

ایک صاحب نے پُرفخر طور پر کہا کہ امریکہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے فلک بوس عمارتیں (Skyscrapers) میں شہرت حاصل کی، میجر ولیم لی بیرن جینی نے ۱۸۸۵ میں پہلی بوس منزلہ بلڈنگ شکاگو میں بنائی۔ اس کے بعد یہ ذوق بڑھتا رہا۔ نیویارک میں ۱۹۳۰ میں کرسلر بلڈنگ بنائی گئی جس کی ۷۷ منزلیں تھیں۔ ۱۹۳۱ میں نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بنی جس میں ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ ۱۹۷۳ میں شکاگو میں سیرس ٹاور بنایا گیا جس کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ موجودہ سیرس (Sears) میں ۱۳ ہزار کارکن کام کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان ریٹیل شاپ ہے، چنانچہ اس کو ہر چیز کی دکان (Everything stores) کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ انسانی کارنامہ سے زیادہ خدائی کارنامہ کو یاد دلاتا ہے۔ یہ غیر معمولی اونچی عمارتیں تمام تر لوہا (اسٹیل) کا کرشمہ ہیں۔ قرآن میں ہے کہ لوہے کے اندر خدا نے بأس شدید (الحدید ۲۵) پیدا کیا ہے۔ لوہے کی اسی قدرتی صفت نے اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ زمین کے اوپر اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کی جاسکیں۔

"اسکائی اسکریپر" کو دیکھ کر آپ کے اوپر استعجاب کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ مگر یہ استعجاب حقیقۃً انسانی انجینیرنگ پر نہیں بلکہ خدائی تخلیق پر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ انجینیرنگ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی تخلیق کا انسانی استعمال ہے۔ "لوہا" تخلیق ہے اور "اسکائی اسکریپر" صرف اس کا ایک استعمال۔

ایک امریکی سے ملاقات ہوئی جو واشنگٹن کا رہنے والا تھا۔ واشنگٹن امریکہ کی راجدھانی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ واشنگٹن کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ اس نے مسکرا کر کہا:

People only leave Washington by way of the box — ballot or coffin.

یعنی لوگ واشنگٹن کو صرف بکس کی راہ سے چھوڑتے ہیں۔ ووٹ کا بکس یا تابوت کا بکس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجدھانی ہونے کی وجہ سے واشنگٹن میں ہر قسم کی اعلیٰ ترین سہولتیں مہیا ہیں۔

اس کے علاوہ تمام اہم ترین سیاسی فیصلے یہیں ہوتے ہیں۔ جس شخص کو واشنگٹن میں کوئی جگہ مل جائے، وہ اس کو آخری سمجھ کر اس سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جس "واشنگٹن" کا حال یہ ہو کہ ایک "بکس" آدمی کو اس سے جدا کر دے، اس واشنگٹن کی کیا حقیقت۔ "واشنگٹن" تو وہ ہے جس میں ہمیشگی کی صفت پائی جائے۔ اور ایسا واشنگٹن آدمی کو جنت کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے گھر پر تھا۔ صبح فجر کے وقت اچانک خطرہ کا الارم بجنے لگا۔ چند سکنڈ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ صغیر احمد صاحب نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے فوراً آواز آئی کیا آپ ٹھیک ہیں۔ (Are you O.K., Sir?)۔

یہاں پر گھروں میں ایک سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے جس کو سیکورٹی الارم سسٹم کہتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی شخص دروازہ کھول کر باہر نکلے یا اندر داخل ہو تو الارم فوراً بجنے لگتا ہے۔ اور عین اسی وقت پولس کے کنٹرول روم میں لال بتی جل جاتی ہے۔ پولس ایک منٹ کے اندر صاحب مکان کو ٹیلی فون کر کے خیریت معلوم کرتی ہے، یہ ٹیلی فون اسی کے مطابق، پولس کے دفتر سے آیا تھا۔ مذکورہ الارم کا قصہ اس لیے پیش آیا کہ ہمارے ایک ساتھی نے فجر کے وقت باہر جانے کے لیے گھر کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اتنے زبردست انتظام کے باوجود امریکہ میں مسلسل قتل اور ڈاکہ کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پرامن سماج کے قیام کے لیے مشینی انتظام کے سوا بھی ایک چیز درکار ہے۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔ صرف مشینی انتظام کبھی پرامن سماج کے قیام کی ضمانت نہیں بن سکتا۔

صغیر احمد اسلم (پیدائش ۱۹۳۶) کمالیہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اب وہ امریکی شہری ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا ۱۹۵۱ کا ایک واقعہ بتایا۔ رمضان کا زمانہ تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر وہ بائیسکل کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے بازار سے آلو بخارا اور مالٹا خریدا۔ اس کو بائیسکل کے پیچھے رکھ کر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک شخص ملا۔ اس نے ان کو روکا اور کچھ آلو بخارا زبردستی نکال کر لے لیا۔ صغیر احمد اسلم صاحب نہ غصہ ہوئے اور نہ اس سے دوبارہ اپنا آلو بخارا چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے انھوں نے کہا: دیکھو، یہ مالٹا ہے، اس میں سے بھی لے لو۔

آدمی نے مزید کوئی چیز نہ لی، وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

مذکورہ واقعہ میں ایک صورت یہ تھی کہ صغیر اسلم صاحب یہ سوچتے کہ ابھی تو اس نے صرف آلو بخارا لیا ہے، اگر میں کمزوری دکھاؤں تو وہ مالٹا بھی لے لے گا۔ اور اگر میں نے مزید کمزوری دکھائی تو وہ میری بائیسکل بھی چھیننے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس قسم کے خیالات صرف شیطانی وسوسہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر خود عمل نہ کرنا فطرتِ خداوندی کو عمل کرنے کا موقع دینا ہے۔ چنانچہ صغیر اسلم صاحب نے جب کوئی مخالفانہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تو مذکورہ آدمی کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فطرتِ خداوندی نے وہ کام زیادہ بہتر طور پر کر دیا جس کو انسان صرف ناقص طور پر انجام دیتا۔

جناب صغیر اسلم صاحب یہاں کپڑے وغیرہ کی تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۵ میں ایک بار ایک اخبار میں اشتہار نکلا کہ فلاں ہوٹل میں ہمارا لکچر ہوگا جس میں بتایا جائے گا کہ آپ مفید طور پر کوئی جائداد (Real estate) کس طرح حاصل کریں۔ اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ اس کی کوئی فیس نہیں ہے۔ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ہال بالکل بھرا ہوا تھا۔ بلکہ سیٹ پر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی سامعین میں موجود تھے۔

اس اجتماع میں انھوں نے محض اپنا تعارف کرایا اور کچھ ابتدائی باتیں بتا کر کہا کہ کل ہمارا آٹھ گھنٹہ کا کورس ہوگا، اس میں تمام تفصیل بتائی جائے گی اور اس کی فیس ۵۰۰ ڈالر ہوگی۔ صغیر اسلم صاحب نے ۵۰۰ ڈالر دے کر ٹکٹ خرید لیا۔ اگلے دن وہ ہال میں پہونچے تو وہاں بمشکل ایک درجن آدمی موجود تھے۔ انھوں نے آٹھ گھنٹہ کے کورس میں شرکت کی۔ اس میں انھیں جائداد کی خریداری کے بارہ میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے اگلے چند مہینوں میں ۱۰ مکانات کی خریداری مکمل کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کام میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ صرف تین سال میں ان مکانات کی قیمت دگنا ہو گئی۔ انھوں نے پانچ سو ڈالر خرچ کر کے پانچ لاکھ ڈالر کمائے۔

اس دنیا میں کامیابی کے لیے حوصلہ درکار ہے۔ جو شخص حوصلہ مند نہ ہو، وہ اس دنیا میں کبھی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

۱۔ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کی طرف سے پیارے لال بھون میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں سلمان رشدی کی کتاب (سیٹنگ ورسز) پر تقریریں ہوئیں۔ اور اس کے جواب میں ڈاکٹر ماجد علی خاں کی لکھی ہوئی کتاب (The Holy Verses) کا اجراء عمل میں آیا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۔ آریہ سماج (جنک پوری، نئی دہلی) کی طرف سے اپریل ۱۹۸۹ میں ایک ہفتہ منایا گیا۔ اس میں مختلف مذاہب کے ذمہ دار افراد کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۵ اپریل ۱۹۸۹ کو اس میں صدر اسلامی مرکز کی تقریر رکھی گئی تھی اور پروگرام میں ان کا نام بھی چھاپ دیا گیا تھا۔ مگر رمضان کی وجہ سے اس میں شرکت نہ ہو سکی۔ البتہ اس کے منتظمین کو مرکز کی کچھ مطبوعات بطور تعارف بھیج دی گئی ہیں۔

۳۔ نئی دہلی (کانسٹی ٹیوشن کلب) میں ۱-۲ اپریل ۱۹۸۹ کو صوفیاء کے سماجی رول پر ایک سمینار ہوا۔ اس کا اہتمام عبدالرحیم خانخانہ میموریل سوسائٹی اور اردو اکادمی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۲ اپریل کے اجلاس میں مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔

۴۔ الرسالہ کے مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں کثرت سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ کچھ حوالے کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور کچھ حوالے کے بغیر۔ اس سلسلہ میں اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ جو لوگ الرسالہ کے مضامین الرسالہ کے حوالے کے بغیر نقل کر رہے ہیں، ان کے قارئین ان کو پڑھتے ہی فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ الرسالہ کا مضمون ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے کہ الرسالہ کے پیغام کے ساتھ الرسالہ کا اسلوب بھی آج ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ نام نہ لیا جائے تب بھی لوگ کہہ پڑتے ہیں کہ یہ تو الرسالہ کی بات ہے، یہ تو الرسالہ کا اسلوب ہے۔

۵۔ عبدالکریم نبی بخش صاحب (۶۷ سال) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے

یکم اپریل ۱۹۸۹ کی ملاقات میں بتایا کہ ان لوگوں نے ایک مسلمان پائلٹ آفیسر کے نام الرسالہ انگریزی جاری کرایا تھا۔ ڈیڑھ سال کے مطالعہ کے بعد ان کی ملاقات مذکورہ پائلٹ آفیسر سے ہوئی۔ انھوں نے تاثر پوچھا۔ پائلٹ آفیسر نے کہا کہ میرے تاثر کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ الرسالہ کے مطالعہ ہی کی وجہ سے ایسا ہوا کہ میں ہوائی جہاز کی سروس میں ہوتے ہوئے شراب کے استعمال سے بچ گیا، ورنہ وہاں تو شراب پانی کی طرح پی جاتی ہے۔

۶۔ الرسالہ (اردو، انگلش) دوسری خدمات کے علاوہ ایک خدمت یہ انجام دے رہا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف الزامات کا علمی سطح پر مدلل جواب دیتا ہے۔ یہ جوابات نہ صرف یہ کہ لوگ خود پڑھتے ہیں بلکہ وہ اس کو دوسرے اخبارات ورسائل میں چھپوا کر اس کو مزید وسیع تر دائرہ میں پہنچاتے ہیں۔ الرسالہ انگلش میں مسٹر ارون شوری کے بعض سنگین الزامات کا مدلل اور سائنٹفک جواب دیا گیا تھا۔ اس کو محمد رفیع عمر صاحب نے بمبئی کے ایک اخبار The Afternoon Despatch & Courier میں پہنچایا۔ اس اخبار نے اپنے شمارہ ۲۴ مارچ ۱۹۸۹ میں صفحہ ۱۱ پر اس کو مکمل طور پر شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے Distorting the Facts -

۷۔ محمد سکندر عالم (عالم بک اسٹور، جھومپورا، اڑیسہ) لکھتے ہیں کہ اُن کے یہاں ۳-۴ مارچ ۱۹۸۹ کو ایک بہت بڑا دینی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے جلسہ گاہ میں اسلامی مرکز کی مطبوعات اور الرسالہ کا اسٹال لگایا۔ کافی لوگ اسلامی مرکز سے متعارف ہوئے اور اچھا تاثر لیا۔ الرسالہ اور کتابیں جو اسٹال پر موجود تھیں، سب کی سب پہلے ہی روز فروخت ہوگئیں۔ اس کے بعد ہمارا اسٹال صرف نمائشی اور تعارفی مرکز بن کر رہ گیا۔ پرچہ اور کتابوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ لوگوں کا بیان تھا کہ الرسالہ اور اسلامی مرکز وقت کے اہم تقاضے کے عین مطابق ہیں۔

۸۔ شجاعت اللہ خاں صاحب ایڈوکیٹ سپریم کورٹ (نئی دہلی) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ اپنے خط یکم اپریل ۱۹۸۹ میں لکھتے ہیں: آپ کے مضامین بہت معیاری ہوتے ہیں اور مسائل پر بحث مکمل اور آسان طریقہ سے کی جاتی ہے۔ آپ کا طریقہ قانونِ خداوندی

کو سمجھانے کا جدید اور سائنس پر مبنی ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سارے علماء صاحبان کو آپ کا طریقہ تحریر ہی اپنانا چاہیے۔

۹۔ ایک خاتون لکھتی ہیں کہ میں اپنے بچوں سے ملنے کے لیے ہندستان سے عمان آئی ہوں۔ یہاں ہمارے پڑوس میں بہت سے غیر مسلم رہتے ہیں۔ ان کو میں نے انگریزی رسالہ دیا۔ اسی طرح سفر کے دوران جہاز میں ایر ہوسٹس وغیرہ کو بھی انگریزی رسالے دیئے۔ یہاں عمان۔ برطانیہ ایگزیبشن لگی ہوئی تھی، ۲۰ فروری سے ۲۶ فروری ۱۹۸۹ تک۔ وہاں بھی بہت سی انگریز عورتوں کو میں نے انگریزی الرسالہ کے پرانے شمارے دیئے۔ اسی طرح سنگاپور میں نومسلموں کی تنظیم ہے، ان کو بھی ہم نے الرسالہ انگریزی کے شمارے بھجوائے ہیں۔ (والدہ نکہت ضیاء)

۱۰۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: تیوہار اور قومی یک جہتی۔ اس تقریر میں قومی تیوہاروں کی سماجی حیثیت اور ان کے انسانی پہلو کو بیان کیا گیا۔

۱۱۔ بنگلور کے ارشاد احمد خاں (پیدائش ۱۹۶۴) سینٹ جوزف کے طالب علم ہیں۔ وہ الرسالہ انگریزی پڑھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے:

I subscribe many Islamic papers. *Al-Risala* (English) is the only paper that inspires me and gives me the right direction.

۱۲۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: "خاتونِ اسلام" کی وی پی وصول کی۔ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد بس چھوڑنے کو جی نہیں چاہا اور جب تک کتاب ختم نہیں ہوئی، دل میں بس آگے ہی آگے پڑھنے کی تڑپ رہی۔ واقعی کتاب اپنے موضوع پر لاثانی ہے۔ اللہ مولانا کے قلم میں اور زور بخشے۔ لکھنے کا انداز بھی انوکھا ہے۔ دل میں اتر کر کے ہی دم لیتا ہے (محمد رحمت اللہ، سیتامڑھی)

۱۳۔ "اسلام دور جدید کا خالق" نامی کتاب جلد ہی پریس سے چھپ کر آنے والی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 July 1989 No 152

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
〃 〃 جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیّبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳